ابدال بیلا
ناول
دہلی
کی
ارجمند بانو
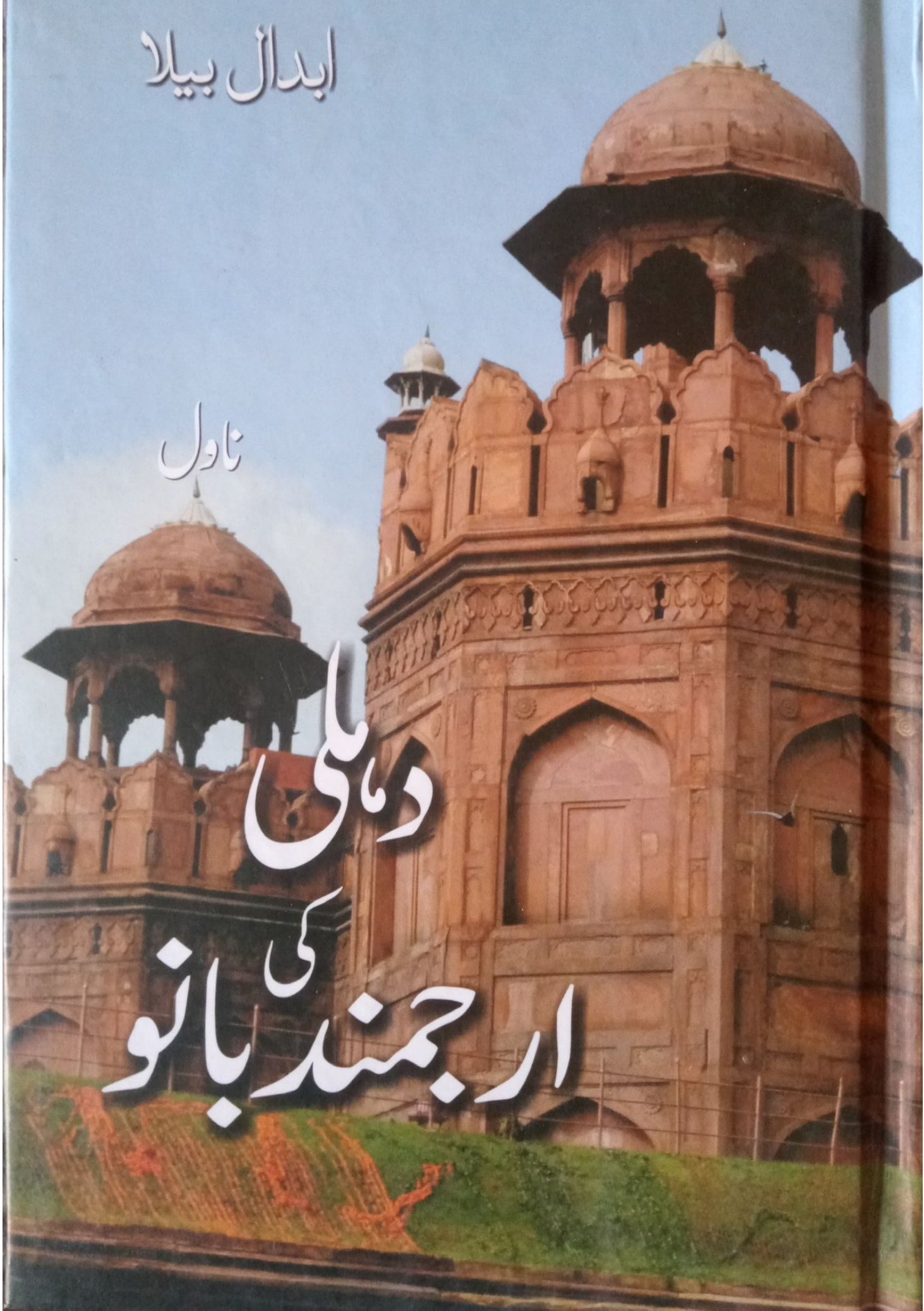
دہلی کی ارجمند بانو

ناول

ابدال بیلا

انیس نقوی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Abdaal Bela
Dehli Ki Arjmand Bano/ Abdaal
Bela.- Lahore : Sang-e-Meel
Publications, 2011.
197pp.
1. Urdu Literature - Novel.
I. Title.

2011
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2435-7
ISBN-13: 978-969-35-2435-2

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز لاہور

انتساب

بابا

عرفان الحق

کے نام

جو دہلی کے جمنا کنارے سے اٹھ کے

جہلم کنارے بیٹھے

خدا کا عرفان بانٹ رہے ہیں

اور

اپنے چھوٹے بھائی

ارشد بلال بیلا

کے نام

جو کہیں ہو، مجھے اس کی

آنکھوں میں بیٹھی ''امی جی'' اور ''نانی جی'' کی آنکھیں نظر آتی ہیں

تاروں سے بھری

انیس نقوی کے

دہلی کی ارجمند بانو

ناول

ابدال بیلا

ترتیب

پیش لفظ

یہ ''لال خان'' کی اس بیٹی ''ارجمند بانو'' کی کہانی ہے جو کہا کرتا تھا، بیٹی، میں پچھلے جنم میں دہلی کا لال قلعہ تھا۔

وہ جمنا پار چاروں طرف ادب سے سر جھکائے کھڑی رعایا کے بیچ کسی شہنشاہ کی طرح سر اُٹھائے استیادہ لال قلعے کی طرف اشارہ کرتا اور کہتا، میں اواگون نظریے پہ یقین تو نہیں رکھتا، مگر مجھے لگتا ہے پہلے اگر میں کبھی کچھ تھا۔ تو یہی تھا۔

لال قلعہ جو برصغیر کا دل ہے۔ برصغیر کو اگر دنیائے عالم کے ہاتھ کی انگوٹھی مان لیا جائے تو ''دہلی'' اس انگوٹھی کا نگینہ ہے۔ اس نگینے کو نین، مکھ اور نصیب دیا جائے تو ارجمند بانو کا سراپا اُبھرتا ہے۔

تمہیں ساری بات، پوری کہانی پڑھے بغیر سمجھ نہیں آئی۔

فکر نہ کرو، میں نے تمہاری انگلی پکڑی ہوئی ہے۔

ارجمند بانو اپنے نصیب سے باتیں کرے گی اور میں تم سے۔

ابدال بیلا

انیس ناگی

لال خان

لال خان، میری نانی ارجمند بانو کا باپ تھا۔ کئی پشتوں سے دہلی میں رہتے رہتے اسے اپنے شہر سے کچھ عجیب الجھا ہوا عشق ہو گیا تھا۔

کبھی کبھی ترنگ میں آتا تو اپنی بیٹی ارجمند بانو کو کندھوں سے پکڑ کے سیڑھیاں چڑھتا اوپر چوبارے کی چھت پہ لے جاتا اور اس کا دایاں کندھا بائیں ہاتھ کی گرفت میں لے کر اپنا دایاں بازو سیدھا کر کے، چاروں طرف گھومتا ہوا، شہر بھر کے مکانوں کی چھتوں، کبوتروں کی چھتریوں، چوباروں، چھجوں، مسجدوں کے میناروں، مندروں کی قلغیوں، اونچے درختوں سے بھرے باغوں اور کھلے میدانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا،

دیکھ یہ ساری دہلی میری ماں ہے۔ میں اس کا بیٹا ہوں۔

اس نے مجھے پالا ہے، اتنا بڑا کیا ہے

اور یہ میں ہوں،

وہ جمنا پار، چاروں طرف ادب سے سر جھکائے بیٹھی رعایا کے بیچ کسی شہنشاہ کی طرح سر اٹھائے، ایستادہ لال قلعہ کے سامنے اپنا کھلا بازو سیدھا کرتا، دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے انگشت شہادت دھیرے دھیرے کھینچ کے سیدھی لال قلعے کی طرف کرتا،

باقی ساری انگلیوں کی مٹھی بنالیتا۔ یہ دیکھ، لال قلعہ اسے بھولنا نہیں۔ اکثر وہ کہا کرتا تھا، کہ میں اواگون پہ یقین تو نہیں رکھتا، لیکن مجھے لگتا ہے، پچھلے جنم میں، میں لال قلعہ تھا۔
آباد لال قلعہ، اطلس و کمخواب کی سرسراہٹوں میں گلاب و عنبر سے مہکتا ہوا لال قلعہ۔

جب میرے وجود میں ابھرتے سورج کی کرنیں یاقوت و پکھراج کی کنیوں میں کرنوں کی بارات بن کے طلوع ہوتی تھیں۔ سونے کے طشت میں پڑی سچے موتیوں کی لڑیوں میں دن بھر کی ساعتیں پروتی تھیں اور شام ڈھلتے سے نیلم و زمرد کی جگمگاتی سانسوں سے چاندنی کو کشید کرتی تھیں۔ چاندنی ان دنوں ادھر پورن ماشی کی محتاج نہیں ہوا کرتی تھی۔ اندھیری راتوں میں بھی وہ میرے وجود کے اندر ٹھہری رہتی تھی۔ میرے دیوان خاص میں تو ہیروں کی چکا چوند سے چاندنی بھی شرما جاتی تھی۔ تمہیں کیا بتاؤں میں کیا تھا، اور میرے اندر کیا نہیں تھا۔

لیکن ابا میں کہاں تھی؟

ایک دن ارجمند بانو نے اپنے باپ کی مسحور کن باتیں سن کے پوچھ لیا۔

تو اب بھی وہیں ہے۔

یہ ادھر دیکھ، لال قلعے کے سامنے بازو اٹھائے ہوئے، آنے والی صدیوں کو پکارتی ہوئی میری بیٹی تم یہ ہو۔ جامع مسجد، تم ہمیشہ سے آباد رہی ہو، آباد رہو گی۔ لیکن میری ماں دہلی بہت بار اجڑی ہے۔ کئی بار لٹی ہے، کئی بار بنی ہے۔

اس ایک شہر میں آٹھ شہر ہیں۔

پھر لال خان اپنی بیٹی کو آٹھوں شہروں کی تفصیل بتانے لگتا۔ کئی بار ارجمند بانو کو وہ ساری کہانی سنا چکا تھا۔ اسے اس کہانی سے عشق تھا۔

وہ دہلی کی بات ایسی دل جمعی سے کرتا تھا جیسے واقعتاً اپنی ماں کی کہانی سنا رہا ہو۔

جانتی ہو کب پیدا ہوئی تھی میری ماں، دہلی۔

مہابھارت کے دور میں، تین ہزار سال پہلے۔

ادھر پرانے قلعے کے پاس اندر پرست نام کا شہر تھا۔

وہ پہلی دہلی تھی۔

اشوک کے پاٹلی پترہ سے بھی ایک ہزار سال پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ بہتیرے راجے، مہاراجے ادھر گزرے۔ انگ پال ادھر لوہے کی لاٹھ لے کر آیا۔ جوتشیوں نے جگہ کا تعین کیا۔ لاٹھ زمین میں گاڑھ دی۔ پھر اسے شک ہوا کہیں غلط نہ گاڑھ دی ہو۔ جوتشیوں سے دریافت کیا جگہ صحیح کہی یا غلط۔ وہ بولے صحیح ہے۔ نیچے زمین کے اندر، عین اسی جگہ پہ اس وقت سانپوں کے بادشاہ شیش ناگ کا سر تھا۔ جو اس سے لوہے کی لاٹھ سے کچلا گیا ہے۔ انگ پال کو شک ہوا کہیں مہنت کہانی نہ سنا رہے ہوں۔

حکم دیا لاٹھ باہر کھینچو۔ اس کا نچلا کونا مجھے دکھاؤ۔

لاٹھ باہر نکلی تو دیکھا، اس کے نچلے کونے پہ تازہ خون لگا ہوا تھا۔ خوش ہو کے بادشاہ نے وہیں پہ لاٹھ دوبارہ لگوا دی۔ شاید اسی لیے ڈھیلی رہ گئی۔ اس سے انگ پال بیچارے کو تھوڑی یہ پتہ تھا کہ یہ تو قطب صاحبؒ کے اونچے قطب مینار کی جگہ طے ہو رہی ہے جس کے سامنے یہ لوہے کی لاٹھ، سرمے دانے کی سلائی نظر آیا کرے گی۔ دلوں کی آنکھ کی بصیرت کا جس سرمے میں وعدہ ہے، وہ سرمے دانی تو قطب مینار کے قرب میں قطب صاحبؒ کی درگاہ میں پڑی ملتی ہے۔

قطب مینار لال خاں کے دادا کی آنکھوں کا آخری منظر تھا۔

انہیں غدر میں ادھر پھانسی پہ چڑھایا گیا تھا۔

یہ پانچ منزلہ مینار ہے۔ ڈھائی سو فٹ اونچا۔ تم تو کئی بار ادھر جا چکی ہو۔ پتہ نہیں تم نے کبھی مینار کی سیڑھیاں گنی ہیں یا نہیں۔ میرے دادا کے وقت میں بھی یہ اتنی ہی تھیں۔ آج بھی تین سو اٹھہتر ہیں۔ لال خاں، ارجمند بانو کو اپنے اسلاف کی کہانی سناتا رہتا، کہتا۔ دادا تو کہتے ہیں ایک سانس میں چڑھ جاتے تھے وہ ساری سیڑھیاں۔ شاید اسی لیے ان کا قطب مینار کے ساتھ لگے پھانسی کے پھندے پہ پہلے جھٹکے میں

ایک ہی سانس آیا۔

غدر کی باتیں شروع ہوتے ہی، ارجمند بانو محتاط ہو جاتی اسے پتہ تھا، اب اس کے ابّا اداس ہو جائیں گے، وہ بات بدلنے کے لیے کہتی، ابّا آپ پہلی دہلی کی بات کر رہے تھے۔

ہاں اسی میں اننگ پال راجا تھا۔ پھر پرتھوی راج کا راج آ گیا۔ پرتھوی کا راج کبھی بھی زیادہ نہیں رہا۔ سچ پوچھو تو پرتھوی راج کا لفظ کبھی راج کو راس نہیں آیا۔ یہ غور کرنے کی بات ہے کہ پرتھوی کے آتے ہی غوری آ تا ہے۔ ابھی دیکھ لو، اُدھر پرتھوی بنا، اِدھر غوری بن گیا۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ پرتھوی کے پر پھیلانے کی دیر تھی۔

غوری آ گیا۔

پرتھوی کا راج سنگھاٹن ہمیشہ کے لیے لپٹ گیا۔ یہ اس دن سے طے ہے۔ شہاب الدین غوری بادشاہ بن گیا ہندوستان کا۔ پہلا اِدھر کا مسلمان بادشاہ۔ پھر قطب الدین ایبک پھر التمش بادشاہ۔ انہی دنوں قطب مینار بنا تھا۔ نچلی منزلیں غوری اور ایبک کی ہیں شاید اوپر کی منزلوں پہ التمش کا نام لکھا ہوا ہے۔ انہی کے زمانے میں قطب صاحب حضرت بختیار کاکیؒ وہاں تشریف لائے تھے۔ ان کا وصال ہوا تو جنازہ التمش نے پڑھایا تھا۔ دیکھو، شیش ناگوں کے سر کچل کے وہاں یادگار، کن کی بنی۔

پھر؟ ارجمند بانو پوچھتی رہتی۔

پھر کیا بیٹی، بادشاہوں نے شہر بسانے اور لوٹنے شروع کر دیے۔ علاؤ الدین خلجی آیا تو دوسری دہلی بنالی۔ سری نام رکھا نئے قلعے کا، حوضِ خاص جدھر ہے۔ وہی علاقہ ہے کشمیری دروازے کے باہر، دلکشا اور مٹکاف ہاؤس کے پاس۔

اسے تعمیرات اور عورتوں کا عشق تھا۔

کملا دیوی سے شادی کی۔

رانی پدمنی سے عشق کیا۔

انتیس لڑائیاں لڑیں۔
کامیاب رہا سبھی میں۔
آخر زہر سے مرا۔

جرنیل اس کا جری تھا۔ نام تھا تغلق۔ پہلے تو کچھ دیر وہ شاہی خانوادے کی سرمستیاں دیکھتا رہا۔ خسرو خان کی عیاشی بھی سہی۔ جب سارے خلجی آپس میں لڑ مر گئے تو جرنل تغلق نے بادشاہی پوشاک پہن لی۔

پھر یہی سلسلہ چل پڑا۔ اسی سلسلے نے آگے چلنا ہے۔ تغلق کا بیٹا محمد بن تغلق نام کا عادل شاہ تھا، تھا ضدی اور بے وقوف۔ اس کے دماغ میں جو سودا سما جاتا وہ اسی کا جنون پال لیتا۔ وزیر مشیر تو ہوتے ہی خوشامدی ٹٹو ہیں۔ ہاں میں ہاں ملا دیتے۔ ایک بار ایران کی فتح کا سودا سما گیا۔ کسی ایرانی کو خراش تک نہ آئی، اپنا بے شمار وقت اور طاقت ضائع کر دی۔ اگلی بار چین پہ یلغار کرنے چلا، چین والوں کو خبر بھی نہ ہوئی، برف پوش پہاڑوں پہ ایک لاکھ فوج پالے میں مروا دی۔ اس قسم کی نامعقول حرکتوں سے خزانہ خالی ہو گیا تو چاندی کے سکوں کی بجائے تانبے کے سکے ٹکسال میں بنوا دیے۔ محصول بڑھا دیے۔ لوگوں کو دکھی کر دیا۔

بادشاہوں کی خرمستیوں کا بھاڑا تو رعایا ہی چکاتی ہے نا۔ چکاتی رہی۔ یہی نہیں۔ ابھی دہلی کی اصل شامت باقی تھی۔ وہ بھی آ گئی۔

کہیں اس کا دکن کی طرف جانا ہوا تو شہر دیوگری دل کو بھا گیا۔ ادھر ایک قلعہ بنا ڈالا پہاڑ کی چوٹی پہ سمندر کنارے۔ دل میں سما گیا کہ اب دہلی سے اٹھ کے ادھر رہنا ہے۔ دیوگری کا نام بدل کے دولت آباد رکھ دیا۔ پھر حکم شاہی دے دیا۔ دہلی کی ساری پرجا، ساری رعایا اٹھا کے آٹھ سو میل دور دولت آباد جا کے رہے۔

منادی کرا دی۔
بادشاہ کا حکم ہے تعمیل ہو۔

جو تعمیل نہ کرے، اسے کوڑے۔
سڑک بنادی۔
قافلے چل پڑے۔
دہلی شہر سنسان ہوگیا۔
گھر ویران،
مکان کھڑے رہ گئے۔ مکین سارے نکل کے دکن کی طرف چلے گئے۔ سن تیرا سو اٹھتیس کی بات کررہا ہوں۔ پہنچ گئی خلقت ادھر۔ دہلی دکن میں جابسا۔ وہ کہتے ہیں نا، قہر درویش بر جان درویش۔ دو تین سال قحط رہا۔ خلقت مرگئی۔ بیماریوں نے آ گھیرا۔ پانچ سال بعد پھر شاہی حکم ہوگیا۔
واپس چلو۔
چلو چلو دہلی چلو۔
چھبیس سال تک وہ مسخرا حکومت کرتا رہا۔
بیٹا اس کا تھا نہیں کوئی۔
امیروں نے اس کے بھتیجے فیروز شاہ تغلق کو بادشاہ بنادیا۔
فیروز شاہ تغلق کو تو تم جانتی ہوگی؟
یہ ملتان میں پیدا ہوا تھا۔ یہ وہی خدا ترس اور انسان دوست شخص ہے جسے خواب میں حضرت بہاؤالدین زکریاؒ نے تین بار زیارت کرائی اور کہا کہ ہمارے پوتے شاہ رکن عالمؒ کو لوگوں نے ہمارے قدموں میں لٹا دیا ہے اور ہم پیر سمیٹ کے لیٹے ہیں۔ ان کے مقام اور مرتبے کا کسی کو علم نہیں۔ انہیں ان کے شایان شان مقام پہ لے کے جاؤ۔ تین بار ایک ہی خواب دیکھ کے فیروز شاہ تغلق کو بات سمجھ میں آ گئی۔ مگر شان شایان جگہ نہ طے ہوئی۔ پھر اسے خیال آیا۔ ملتان قلعے پہ، بہاؤالدین زکریاؒ کے مزار کے پاس ہی جو اس نے اپنے لیے بلند بالا مقبرہ تعمیر کروایا ہے، اس سے بہتر کون سی جگہ

ہوسکتی ہے۔ یوں شاہ رکن عالمؒ دادا کے قدموں سے نکل کے دنیا کے سب سے اونچے گنبد کے نیچے آ لیٹے۔

ظاہر ہے جس بادشاہ کے خواب میں بزرگوں کا آنا جانا ہو، اسے نیک کاموں کی توفیق مل جاتی ہے۔ ملک میں سرائیں، سڑکیں، حوض، شفاخانے تعمیر ہونے لگے۔ دہلی میں پانچواں دہلی تعمیر ہو گیا، فیروز آباد۔ علم دوست بادشاہ تھا۔ کہیں اشوک کا ستون نظر آیا۔ اٹھوا کے لے آیا، جما دیا۔ پھر ایک آفت آ گئی۔

تیمور لنگ حملہ آور ہو گیا۔

اینٹ سے اینٹ بجادی

وہ تو ہیضہ پھیل گیا۔ جس سے دہلی کچھ بچ گیا۔ تیمور ایک تو زخمی ہو گیا اوپر سے ہیضے کے مرض نے آ دبوچا۔ حکیموں نے مشورہ دیا ملائی کھاؤ۔ ایک غلام ملائی کا بھرا پیالہ لایا۔ ابھی تیمور غلام کے ہاتھ سے ملائی کا بھرا پیالہ لے کے کھانے ہی والا تھا کہ غلام نے اسی پیالے کے اندر زور کی قے کر دی۔

ذرا سوچو،

قہر تیموری،

جو بستیاں اجاڑ دیتا تھا،

شہروں میں آباد لوگوں کی کھوپڑیوں کے مینار بنایا کرتا تھا، اس کے ہاتھ میں پکڑے بھرے ملائی کے پیالے میں کوئی غلام قے کر دے۔

گھائل تیمور غصے سے اپنی تلوار اٹھانے ہی والا تھا کہ غلام غش کھا کے گر گیا۔

حکیموں نے ہاتھ جوڑ کے کہا حضور سارے شہر میں ہیضہ پھیل چکا ہے کوچ فرمائیے۔

یوں تیمور کے ہاتھوں تھوڑا بہت دہلی جو بچ گیا وہ ہیضے نے بچا لیا۔ ورنہ جو شہر وہ فصیل توڑ کے ایک بار تاراج کرتا تھا تو اس کا کھنڈر بنائے بغیر نہیں نکلتا تھا۔

تھا وہ حافظِ قرآن،

علم و ادب سے بھی لگاؤ رکھتا تھا۔

شاعری کا دشمن تھا مگر شاعروں کا قدردان تھا۔ جب شہر تاراج کرتا، اعلان کر دیتا، عالموں، ادیبوں اور شاعروں کو امان ہے۔ ان کے گھروں کو امان ہے۔ جو، جو، ان کے گھروں میں چلا جاتا انہیں چھوڑ دیتا۔ باقی سارا شہر فنا کر دیتا۔ کھوپڑیوں کے انبار لگا دیتا تھا۔ ادیبوں اور شاعروں کو موتیوں اور اشرفیوں سے لاد دیتا۔

سمرقند اور بخارا فتح کرنے کے بعد تیمور نے شیراز فتح کیا تو وہاں کے ادیبوں اور شاعروں کی منڈلی لگا کے بیٹھ گیا۔ بوڑھا مفلس پتلا سوکھا خمیدہ کمر حافظ شیرازی بھی وہاں موجود تھا۔ تیمور بگڑ کی اس سے پوچھنے لگا یہ شعر تمہارا ہے؟

؎ اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندویش بخشم سمرقند و بخارا را

(اگر وہ ترک شیرازی محبوب دل لبھا جائے تو میں اس کے گال کے ایک تل پہ سمرقند اور بخارا بخش دوں۔)

حافظ شیرازی نے کہا، ہاں میرا شعر ہے۔

تیمور تیوری چڑھا کے بولا، حد ہو گئی۔ میں خون کی ندیاں بہا کے سمرقند اور بخارا فتح کر کے آیا ہوں۔ تم یہاں بیٹھے بیٹھے معشوق کے گال پہ ایک تل کی خاطر دونوں شہر نچھاور کیے جا رہے ہو۔

تیمور کے بگڑے تیور اور ٹیڑھے سوال سے شاعروں کی منڈلی میں سانپ سونگھ گیا ہر کوئی سمجھا کہ بس اب حافظ شیرازی کی گردن زنی ہو گئی۔ مگر حافظ شیرازی اسی شان فقیری میں بے نیازی سے بیٹھا رہا۔ تیمور کے منہ سے اپنا شعر اور اس کا چبھتا سوال سن کے۔ شمس الدین محمد حافظ شیرازی نے اپنی پھٹی بوسیدہ چیتھڑا نما قمیض کے بٹن کھولے اور اپنی کمزور پسلیاں دکھا کے بولا، ہماری اسی دریا دلی نے تو ہمیں یہ دن دکھایا ہے۔

کہتے ہیں، تیمور زندگی میں پہلی بار حافظ شیرازی کی یہ بات سن کے ہنسا تھا۔ اور خوش ہو

کے اسے ایک ہزار سونے کی اشرفیاں بخش دیں۔

عجیب آدمی تھا تیمور بھی۔ پیدائشی بادشاہ نہیں تھا۔ بس ماوراء النہر کے شہر کیش کے ایک کھاتے پیتے آدمی کا بیٹا تھا۔ جس نے اسے آفاقی خواب بچپن میں دکھا دیے۔ اوپر سے خود، شروع دن سے ہی غیر معمولی اہلیت کا مالک تھا۔ ذہانت ایسی کہ ایک بار جو سن لیتا، پڑھ لیتا اسے ازبر ہو جاتا۔ ناظرہ قرآن پڑھنے گیا تو مہینوں میں حافظ قرآن ہو گیا۔ حافظ قرآن بھی ایسا کے الٹا قرآن بھی ازبر پڑھ لیتا تھا۔ (شاید اسی سے دماغ الٹا گھوم گیا) عالم تھا، فقیہہ تھا، بچپن ہی سے گھڑسواری اور تلوار بازی کی مشق اس کی ہونے لگی تھی۔ باپ نے اس کے لیے ایک عجیب استاد بلوایا۔ استاد پہلے دن آیا تو ساتھ رسی لے کر آیا۔ آتے ہی تیمور کے داہنے بازو کو رسی سے اس کے سینے سے باندھ دیا اور اس کے بائیں ہاتھ میں تلوار دے کر بولا،

اب چڑھ گھوڑے پہ اور تلوار چلا۔

یہ حیران،

یہ کیا ہوا تلوار بازی کا سبق۔

استاد بولا۔ برخوردار، اگر کہیں تمہارا دائیاں بازو کٹ گیا یا گھائل ہو گیا تو تم تو گئے کام سے۔ تم میں اور ایک بے بس مردے میں کیا فرق ہوگا، زیادہ سے زیادہ بھاگ سکو گے۔

بول بھاگنا ہے یا بھگانا ہے؟

دائیاں بازو تو تمہارا کام کرتا ہی ہے۔ اب بائیں بازو کو کام میں لانا سکھاؤ۔ مہینوں میں تیمور بائیں بازو سے بھی تلوار کا دھنی ہو گیا۔ تب اس کے استاد موسیٰ نے اس کے دونوں بازو آزاد کر دیے اور دونوں میں تلواریں دے کر بولا،

اب لڑو۔

ایسے لڑو کہ دشمن سمجھے تم ایک نہیں دو افراد ہو۔

تیرے دونوں ہاتھ، دونوں بازو اب تیری کمان میں ہیں۔

ساری عمر تیمور انہی دونوں بازوؤں سے لڑتا رہا۔ کسی جنگ میں اسے شکست نہ ہوئی۔ بارود کا راز اس کے پاس تھا۔ جس شہر پہ یلغار کرتا، تو پہلے شہر پناہ کے اندر پیغام بھجواتا کہ میں آ گیا ہوں، دروازہ کھول کے دوستوں کی طرح استقبال کرو۔ ایک کوڑی کا نقصان نہیں کروں گا۔ جو لینا دینا ہوا اس کے بھی دام دوں گا۔ اگر مقابلے کا ارادہ ہے، دروازے بند رکھنے ہیں تو پھر ہر بے رحمی کے لیے تیار رہنا۔ کوئی بات مان لیتا تو یہ اپنا وعدہ پورا کرتا۔ کوئی اڑی کرتا تو یہ محاصرہ کر لیتا۔ محاصرے میں جیتنے کا گر جانتا تھا۔ شہر کی دیواروں میں کلیدی جگہوں کو ڈھونڈ کے بارود کے فیتے سے اڑا دیتا۔ اور پھر شہر میں گھوڑے دوڑاتا فوج لے کر داخل ہو جاتا۔

ہر مہم پہ جاتے ہوئے یہ اپنی سپاہ سے دوگنے گھوڑے لے کر چلتا۔

آدھے سفر کے بعد گھوڑے تبدیل کرتا۔

اس کی فوج میں صرف سوار ہوتے تھے۔ پیادہ کوئی نہ ہوتا۔ زندگی میں چند ایک سالوں کے سوا، جو اس کی شادی کے بعد کے کچھ سال تھے، وہ کبھی شہر میں نہ رہا۔ شہر سے باہر ویرانوں میں چھاؤنی بنا کے رہتا۔ چھاؤنی میں اور ہر جنگی مہم میں اس کے خیمے، گھوڑے اور اس کی غذا عام سپاہیوں جیسی ہوتی۔ کہنے کو وہ سات اقلیم کا بادشاہ تھا اور اس کے محلات میں سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کے انبار لگے تھے۔ مگر اس کا کھانا پینا اس کی سپاہ کے عام سپاہی جیسا تھا۔ انہی کے ساتھ زمین پہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ کے کھاتا۔ آخری دنوں میں اس کی ایک ٹانگ زخمی ہو گئی اور یہ ٹانگ گھسیٹ کے چلنے لگا۔ دہلی کے معرکے میں اس کا دائیاں بازو بھی گھائل ہو گیا تھا۔ جس سے یہ پھر قلم نہ پکڑ سکا۔ آخری عمر میں اپنی سوانح عمری بھی اس نے بائیں ہاتھ سے لکھی۔ ہاں تلوار آخری دم تک دونوں ہاتھوں سے چلاتا رہا۔ صرف ایک چین فتح کرنا رہ گیا تھا اسے۔ چین پہ فوج کشی کی تو راستے میں فالج کا حملہ ہو گیا اور مر گیا۔ پانچویں دہلی میں

ایک مسجد کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں جس میں تیمور نے نماز پڑھی تھی۔ کیونکہ نماز کا وہ بہت پابند تھا۔ قتلِ عام کراتے وقت بھی وہ نماز وقت پہ پڑھتا۔ پتہ نہیں کیوں ایک عالمگیر امن پسند مذہب کا پابند ہونے کے باوجود وہ ناحق اتنا شدت پسند ظالم تھا۔ لڑائیاں بھی اس نے زیادہ تر مسلمان ریاستوں سے کیں۔ کہیں کوئی نیا شہر اس نی نہیں بسایا، اجاڑے بہت۔

چھٹی دہلی شیر شاہ سوری نے پرانے قلعے کے پاس بسائی۔

شیر شاہ سوری، بیٹی، اس ملک پہ خدا کا کوئی انعام بن کے آیا تھا۔

کہنے کو اس نے ساڑھے چار سال یہاں حکومت کی، مگر ہم مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت میں یہی ساڑھے چار سال نگینے ہیں۔ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سڑکیں، سرائیں، ڈاک بنگلے، تازہ گھوڑے ڈاک لے جانے والے، پھر امن ایسا کہ کشمیر سے کنیا کماری تک کنواری کنیا اکیلی چلے پھرے، گلے میں سونے، موتیوں اور ہیروں کے ہار ڈالے۔ کسی کی مجال نہیں تھی جو ہاتھ ڈالے۔ حکومت کے خزانے کو آبرومندانہ طریقے سے بھرا رکھنے کے لیے زمینداری پہ عدل سے ٹیکس لگائے۔ زمینوں کی پہلی بار پیمائش کی۔ اسی کا کیا دھرا مغل اعظم اکبر کو مل گیا۔ وہ پچاس سال سے اوپر یہاں تاج پہنے بیٹھا انارکلیاں دیواروں میں چنواتا رہا۔ مزے کرتا رہا۔

عجیب بات دیکھو، ارجمند بیٹی، مغلوں کے پہلے تاجدار بابر کو بھی شیر شاہ سوری جتنا وقت ملا اور اس نے اتنا بڑا ملک فتح کر لیا۔ وہ شیر شاہ کے مقابلے کا تھا، مگر دونوں کی اولاد نکمی تھی۔ بابر کے بیٹے ہمایوں کی میز سے کمر کی چھری کی نوک سے شیر شاہ سوری نے بھنا بکرا کھینچ لیا تھا۔ بابر تاڑ گیا یہ میرے سامنے میرے شہزادے کی پلیٹ سے گوشت کھینچ رہا ہے۔ میرے بعد اس سے ملک چھین لے گا۔ بابر نے ابرو اٹھائے۔ شیر شاہ بھی جان گیا کہ بابر نے تاڑ لیا ہے۔ کھانے کی تقریب سے نکلا اور اپنے گھر کی الٹی سمت پہ گھوڑا دوڑا کے نکل گیا۔ بابر نے پیچھے ہرکارے بھگائے۔ مگر وہ

غلط رخ پہ اسے ڈھونڈتے رہے۔ بابر گیا تو ہمایوں شیر شاہ کے سامنے بچہ تھا۔ بھگا دیا اس کو۔ پھر شیر شاہ کے بعد اس کی اولاد نکمی نکلی۔ ہمایوں کے جنرل بہرام خان اور نوعمر شہزادے اکبر کے سامنے وہ سارے بونے تھے۔ بعد میں جب بونے ہی بونے رہ گئے، تو قد آور باہر سے آ گئے۔ اسی لیے تو گورے آ گئے۔ خود بیچارہ تاج محل آگرے میں بنوانے والا شاہجہان اپنی زندگی کے آخری چودہ سال قید ہوا، جھروکے سے اپنی بیگم کے لیے بنائے لاثانی مقبرے کو دیکھ دیکھ فاتحہ پڑھتا رہا۔

انگریزوں نے شیر شاہ کی بنائی چھٹی دہلی کے پاس انڈیا گیٹ بنا دیا اور پہلی جنگ عظیم اور افغان جنگ میں اپنے ہندوستانی مرنے والے چھیاسی ہزار سپاہیوں کے نام اس پہ کندہ کروا دیے۔ ہندوستانیوں کو پرائی چپقلش سے مروانے کی داغ بیل اس سے پڑی۔ آگے دیکھنا، بیٹی۔ انگریزوں نے اور یہاں کتنے بندے مروانے ہیں۔

ساتواں دہلی، سترھویں صدی میں شاہ جہان نے بسایا اور دارالخلافہ آگرے سے دہلی لے آیا۔ شاہجہان آباد ہی اب آباد، دہلی کا نام رہ گیا ہے۔ بس نام ہی رہ گیا ہے دہلی۔ دل تو دلی کا اسی دن نکل گیا جب دلی کے بادشاہ شاہجہان کو اس کے ہونہار بیٹے اورنگ زیب عالمگیر نے قید کر کے چودہ سال لمبے لیے اپنی ماں کے مقبرے تاج محل کے سامنے بنی جیل میں ڈال دیا تھا۔ کہنے کو اکبر اعظم کی طرح اورنگ زیب نے بھی آدھی صدی تک ہندوستان میں راج کیا۔ مگر جس راج کی پہلی اینٹ سے دہلی کا دل نکل گیا ہو وہاں کسی راج گدی کے نصیب میں دل گساری کیسے آتی۔ عالمگیر نے حصول تاج کی جو روایت ڈالی تھی وہ اس کے بیٹوں، پوتوں اور پڑپوتوں کے خون میں رنگ کے رنگیلے پیدا کرنے لگی۔ شاید اسی لیے پھر آفات کثرت سے وہاں آنے لگیں۔ پہلی آفت نادر شاہ تھا۔ نادر شاہ سوا سات فٹ اونچا عفریت تھا۔ ایران اور افغانستان اس کے زیر نگیں تھے۔ دہلی میں محمد شاہ رنگیلے کی رنگ رلیوں کے دنوں دکن کے نظام الملک اور دہلی کے وزیر سعادت خان نے بادشاہ کے خلاف ساز باز کر کے

نادر شاہ کو بلاوے کا خط لکھ بھیجا۔ وہ دندناتا آ گیا۔ دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ہیضہ بھی اس بار دہلی کو بچانے کے لیے نہ پھیلا مگر طاعون آ گیا یہ طاعون انگریز سپاہ تھی جو سوداگروں کے بھیس میں آ گئی۔

آٹھواں شہر دہلی انہی فرنگیوں نے بسایا اور اس کا نام نئی دہلی رکھ دیا۔ اجلی اجلی چوڑی سیدھی سڑکیں، کناروں پہ باغیچے، کھلی کھلی عمارتیں، شرقی سرے پہ انڈیا گیٹ، مغربی حد پہ وائس رائے محل: تین سو چالیس کمروں کا گھر۔ جس میں سوا چار سو مالی باغیچوں میں پانی دیتے اور بوٹوں کی دیکھ بھال کرتے۔ پچاس کارندے صرف پرندوں کو اڑانے پہ متعین تھے۔ یہ محل ۱۹۲۹ء میں مکمل ہوا۔ جن دنوں لال خاں، اپنی بیٹی ارجمند بانو کو، اپنی ماں، دہلی کی کہانی سنایا کرتا تھا۔ ان دنوں ابھی نئی دہلی کی عمارتیں بن رہی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ انڈیا گیٹ اور وائس رائے محل کے درمیان، راج پاٹھ کے ساتھ کنگ جارج پنجم کا مجسمہ "شاہ ہند" ایستادہ ہو چکا تھا۔ یہ ۱۹۱۱ء کی بات ہے۔

ارجمند بانو، میری نانی، جب ان کی عمر ابھی بارہ سال تھی، اپنے باپ سے اکثر پوچھا کرتی تھی۔ ابا! نئی دہلی بھی آپ کی ماں ہے۔ تو لال خان کا چہرہ ایک دم لال سرخ ہو جاتا تھا۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا کرتے تھے۔

نہ، ماں میری صرف دہلی ہے۔
نئی دہلی میری سوتیلی ماں ہے۔
میری ماں جمنا کی لائی ہوئی پاوتر سادی مٹی کی بنی ہے،
یہ سمندر پار سے لائی ہوئی میم صاحب ہے۔
یہ کہہ کے وہ اکثر ہاتھ ملتے ہوئے زیر لبی کہا کرتا تھا۔
سوتیلی مائیں اکثر گھروں کو اجاڑ دیا کرتی ہیں۔
بٹوارے کرا دیا کرتی ہیں۔

یہ میم صاحب کہیں مجھے میری ماں سے دور نہ پھنکوا دے۔
دیس نکالا نہ کرا دے۔
بیٹی تم میری بات یاد رکھنا، تمہی نے بات یاد رکھنی ہے، یاد کرانی ہے۔
اندھیروں کو روشنی اپنی طرف کم ہی بلایا کرتی ہے۔
تمہی نے یہاں اجالوں کے پھول بونے ہیں۔
دلوں کو تم ہی نے روشنی سے بھرا رکھا ہے۔ میں شاہی مسجد کی اذان کی بات کر رہا ہوں بیٹی۔ تم جس صبح پیدا ہوئی تھی تو تمہاری پہلی آواز کے ساتھ ہی اس مسجد سے اللہ اکبر کی آواز بھی میں تے سنی تھی۔ اسی دن مجھے احساس ہوا تھا کہ بیٹیاں مسجدوں کی طرح پاکیزہ ہوتی ہیں۔ آنے والی نسلوں تک تم نے ہی اس کی اذان سنبھال کے رکھنی ہے۔ مجھے تو بیٹی تمہارے کان میں اذان دینے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ شاہی مسجد کے میناروں کی آواز ہی پہلی وہ آواز تھی جو تیرے کانوں میں پڑی۔
مگر بیٹی!
اگر کسی نے اس آواز دیتے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھنا چاہا تو یہاں لکیریں پڑ جائیں گی۔ دراڑیں پڑ جائیں گی۔
میں اسی وقت سے ڈرتا ہوں۔
اس نئی دہلی نے، میری سوتیلی ماں میم صاحب نے انصاف نہیں کرنا۔
سوتیلی مائیں کبھی انصاف نہیں کیا کرتیں۔
خدا جانے ایسا کیوں ہے؟

□

ارجمند بانو

ارجمند بانو گوری چٹی، پتلی پھرتیلی تیز تیز قدم اٹھا کے چلنے والی لڑکی تھی۔ قد چھوٹا تھا، پیشانی چوڑی اور کچھ ابھری ہوئی۔ بال لمبے اور سیدھے تھے۔ سرسوں کا تیل استعمال کرنے کی وجہ سے ان میں غیر معمولی چمک اور سیاہی آ گئی تھی۔ مانگ وہ درمیان سے نکال کے سوتی دھاگے کا کالا پراندہ باندھے رکھتی۔ تیز تیز چلتی تو پراندہ کمر پہ سنپولیے کی طرح جھولتا پھرتا۔ ناک چھوٹا اور قدرے موٹا تھا۔ پتلے ہونٹوں اور پھولے ہوئے گالوں پہ ہمیشہ لالی رہتی تھی۔ جو ذرا ذرا سی بات سے لال سرخ ہو جاتے تھے۔ بڑی بڑی کالی سیاہ حیرت بھری بچوں جیسی آنکھیں تھیں اس کی۔ جن میں ایک عجیب سا دکھ بھرا ہوا تھا۔ جیسے وہ کسی ایسے بچے کے چہرے کی آنکھیں ہوں جو بھرے میلے میں گم ہو گیا ہو۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ان کی عمر انیس سال کی تھی اور ان کے خاوند کو پہلی جنگ عظیم میں لڑنے انگریز کی وردی میں فرانس گئے چار سال ہو چکے تھے اور وہ دہلی کی گلی بلی ماراں میں اپنے والدین کے گھر رہ رہی تھیں اور میرے نانا سے ان کی شادی ہونے میں پونے دس سال باقی تھے اور میری والدہ کے ان کے بطن سے پیدا ہونے میں گیارہ سال پڑے تھے۔

ارجمند بانو کا گھر اور کنبہ دہلی کی طرح کئی بار اجڑا اور بسا تھا۔ ان دنوں وہ اپنے

والدین کے جس مکان میں رہ رہی تھی وہ حویلی تو نہیں تھی نہ اس کا رنگ پیلا تھا۔ مگر اس کے ابا اسے بھی پیلی حویلی ہی کہا کرتے تھے۔ پیلی حویلی اصل میں اس کے ابا لال خان کے دادا کی حویلی کا نام تھا۔ جن کا نام شائستہ خان تھا، شہنشاہ کے دربار میں انہیں رتبہ ملا ہوا تھا۔ شاہی نقاش تھے۔ تصویریں بنایا کرتے تھے۔

وہ غدر کے دنوں میں پھانسی چڑھے اور ان کی حویلی سمیت ان کا سارا محلّہ گرا کے میدان بنا دیا گیا۔ کہتے ہیں فرنگی جب دلی کے گھر گھر کی تلاشی لیتے پھرتے تھے تو کہیں ان کی پیلی حویلی سے کشمیری دروازے کی تصویر ایک مل گئی۔ موٹے کھڈی کے کاتے ہوئے سوتی کپڑے پہ روغنی چمکتے رنگوں سے بنی ہوئی تصویر میں کشمیری دروازے سے کشمیر کو جاتی ہوئی چمکتی راہ تھی۔ راہ پہ دھوپ بکھری ہوئی تھی۔ دھوپ صبح کی لگتی تھی کیونکہ اس کی چمک میں زندگی ایسے مسکرا رہی تھی جیسے ابھی ابھی بیدار ہوئی ہو۔ پیش منظر میں کشمیری دروازے کے آگے قدم اٹھاتا ہوا ایک ہاتھی کھڑا تھا۔ ہاتھی کے ہودے میں شاہی سوار تھا۔ زرق برق فاخرہ لباس میں ملبوس اوپر سنہری چھتری، چھتری کے اوپر صبح کی دھوپ۔ شاہ کے چہرے پہ چھاؤں ہوتے ہوئے بھی دھوپ جیسی کرنیں تھیں جیسے صبح یہاں سے گزرتے گزرتے رک گئی ہو۔ نیچے بازار میں ہاتھی سے تین قدم ہٹ کے بائیں طرف ایک فرنگی لال کُرتی کے نیچے ٹانگوں پہ سفید برجیس اور پیروں سے پنڈلیوں تک گرہ لگے سواروں جیسے جوتے جوڑے اپنی لمبی سی لاٹھی نما بندوق کو دونوں ہاتھوں میں دیے، اپنے سینے کے آگے تان کے رکھے ادب سے سلامی دینے کے انداز میں چوکس کھڑا تھا اور فرنگی کے پیچھے سالم کشمیری دروازہ تھا۔ غدر میں فرنگیوں نے توپیں داغ داغ کے کشمیری دروازہ توڑ دیا تھا۔ ایک ساتھ پچاس پچاس توپیں داغی جاتی تھیں۔ ہاتھی جیسی موٹی دیوار منوں گارے چونے کی پکڑ سے نکل کے فیتی فیتی ہوگئی۔ اسی طرف سے فرنگی شہر پناہ کے اندر آئے۔

قیامت مچ گئی۔

گلی گلی میں پھانسیوں کے پھندے کھڑے ہو گئے۔
گھر گھر تلاشی لی جانے لگی۔
کوئی گھر فرنگیوں کی زد سے نہ بچا۔
شائستہ خان کی پیلی حویلی بھی نہ بچ سکی۔ پیلی حویلی کو لال خان کے دادا شائستہ خان نے نقاش حویلی کا لقب دے رکھا تھا۔ اس کے دروازے پہ بھی فرنگیوں نے لمبے جوتوں کی ایڑھیوں سے دستک دے دی۔ اندر آئے تو تصویریں ہی تصویریں اور کشمیری دروازے کی وہ تصویر بھی جس میں شاہی ہاتھی سوار کشمیر کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ نیچے فرش پہ فرنگی پاؤں جوڑے ادب سے سہا سلامی دے رہا تھا اور پیچھے کشمیری دروازہ سالم نظر آ رہا تھا۔
انگریز افسر تو وہ تصویر دیکھتے ہی پلے ہوئے سانڈ کی طرح اپنے ناک میں پھونکیں مارنے لگا۔ تصویر میں کشمیری دروازے کا رنگ بھی کچھ زیادہ لال تھا۔ جیسے اینٹ روڑوں سے لہو ٹپک رہا ہو۔ پتہ نہیں شائستہ خان نے تصویر بناتے ہوئے اسے ایسے بنایا تھا یا انگریز افسر کو اس کا رنگ زیادہ سرخ لگا۔ انگریز سے وہ تصویر دیکھی نہ گئی۔ کمر سے خنجر نکال کے انگریز افسر نے گالیاں دیتے ہوئے اس تصویر کو ایسے پھاڑا جیسے وہ کسی کا پیٹ ہو۔ سوتی کپڑے پہ تیل ملے رنگوں سے بنی تصویر تھی۔ لکڑی کے چوکھٹے پہ تنی ہوئی، دیوار سے ایک قدم نیچے سے باہر نکال کے دیوار سے ٹیک دے کے کھڑی کی ہوئی تھی۔ چر چر کر کے پہلے ہی خنجر کے وار سے ایسی پھٹی کہ شاہی ہودے پہ بیٹھے شہنشاہ کی گردن اوپر رہ گئی اور شاہی دھڑ، ٹانگیں اور پورا ہاتھی دوہرا ہو کے نیچے لٹک گیا۔ پیچھے نظر آتا کشمیری دروازہ بھی اپنے ستونوں سے الگ ہو گیا۔ انگریز نے تصویر میں چاقو مار کے کچھ ایسے گھمایا کہ ساری تصویر پھٹ گئی، کونے پہ سلامی دیتا چوکس کھڑا فرنگی صرف نظر آتا رہ گیا۔
انگریز افسر غصے سے بڑبڑائے جا رہا تھا۔ اس کے حکم دینے سے پہلے ہی اس کے

کچھ سپاہیوں نے لال خان کے دادا شائستہ خان کو پکڑ لیا۔ وہ پتلا، جھکی کمر اور مٹھی بھر
سفید داڑھی والا ہر سمے منہ ہی منہ میں کوئی قرآنی ورد پڑھنے والا بڈھا تھا۔ ہر وقت اس
کے ہونٹ خاموشی سے کسی ذکر سے ہلتے رہتے۔ تھا بھی خاموش طبیعت، کم گو مگر اس کی
تصویریں بڑا شور مچاتی تھیں۔ اپنی تصویروں میں وہ بڑے شوخ اور بھڑکیلے رنگ بھرتا تھا
مگر پہنتا خود سفید پارچا جات تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنی حویلی کے اُس کمرے میں تھا
جہاں تیار کیے ہوئے رنگوں کے ڈبے، صراحیاں اور مرتبان بھرے پڑے تھے۔
تپائیوں پہ ہر سائز کے برش دھرے تھے۔ فرنگیوں نے اس کمرے میں رنگوں سے
بھرے مرتبانوں اور صراحیوں پہ اندھا دھند ایسی ٹھوکریں ماریں کہ رنگ اڑ اڑ کے
شائستہ خان کی سفید شیروانی، داڑھی اور براق پاجامے پہ کسی غیر زمینی عفریت کے کیچڑ
خون چھینٹوں کی طرح پڑ گئے۔ فرنگیوں کے جوتے بھی رنگوں سے لال نیلے ہو گئے۔
انگریز افسر نے اپنے جوتے پہ گرا ہوا فیروزی رنگ شائستہ خان کی پنڈلیوں پہ مار مار
کے اس کے سفید پاجامے سے صاف کیا۔ شائستہ خان گھٹنے کے پیچھے سے لگی چوٹوں
کے باعث گرا تو اپنے نحیف ہاتھوں کے سہارے زمین پکڑ لی۔ اس کی ایک کہنی پہ کسی
سپاہی نے ٹھوکر ماری تو وہ بائیں کندھے کے بل چت گر پڑا۔ نیچے فرش پہ گرے بہتے
نیلے، پیلے، کالے، لال اور فیروزی رنگوں سے اس کا چہرہ، داڑھی اور سفید کپڑے
لتھڑ گئے۔ اس کے نیلے ہوتے کمزور بوڑھے مرجھائے ہونٹوں پہ فیروزی رنگ کا ایک
لڑھکتا ہوا ڈبہ گرا تو وہ اس کے ہونٹوں پہ ورد کی مسلسل جنبش سے فیروزی بلبلے بننے
ٹوٹنے لگے۔ سپاہیوں نے گرے ہوئے شائستہ خان کے کمزور بوڑھے نحیف رنگے
ہاتھوں کو پکڑ کے مروڑا اور کمر کے پیچھے کھینچ کے باندھ دیا۔ گھر کے باقی افراد کو بھی
چوپایوں کی طرح سوٹیاں مار مار کے نکال لیا۔ تصویریں پھاڑ دیں، باقیوں کو اکٹھا
کر کے جلا دیا۔ رنگوں کے مرتبان، صراحیاں اور ڈبے اٹھا اٹھا کے گھر والوں کے سروں
پہ مار مار کے توڑ دیے۔ شائستہ خان نے حلق سے ایک بات بھی نہ نکالی۔ ورد اس کے

ہونٹوں پہ کچھ اور تیز ہو گیا، رنگ برنگے بلبلے بنتے ٹوٹتے رہے۔ وہ نام ہی کا نہیں اطوار کا بھی شائستہ تھا۔ باتیں بنانے کی اسے عادت نہیں تھی، کبھی بولنے لگتا تو ایسی مٹھاس بھری حلاوت سے وہ باتیں کیا کرتا کہ لوگ مٹھائی کی دوکان سے مڑ کے اسے سننے آتے تھے۔ بادشاہ کے دربار میں اس کی مخصوص نشست تھی۔ شاہ کا ان دنوں علاقہ ہی کتنا تھا۔

سلطنت شاہ عالم

از دہلی تا پالم پور

اسی کے دربار میں اسی کا کٹہرا لگ گیا۔ تخت سے اتار کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔ بادشاہ تو شائستہ خان سے بھی عمر میں بڑا تھا۔ سفید ریش، کمزور و ناتواں، قلم کا آدمی تھا۔ شاعری سنتا، شاعری کرتا، کبھی اس کے روبرو شائستہ خان، شاہی خانوادے کی بجی ہوئی روغنی تصویریں قمقمے جڑاؤ فریموں میں سجا کے لاتا تھا۔ قید ہوا تو اسی شاہ کے سامنے خون بھری ہوئی طشتریوں میں اس کے بیٹوں کے گردن سے کاٹے ہوئے سر لا لا کے دکھائے گئے۔ جب اسے دکھانے کو کوئی اور منظر نہ بچا تو کالا پانی کی سزا دے کر اسے رنگون بھیج دیا۔ جگہ جگہ پھانسیوں کے پھندے کھڑے تھے۔ سارے شہر کے سارے گھر انگریز نے اپنی ملکیت بنا لیے۔ ہر گھر میں اس کی فوج کے لوگ دندناتے جاتے۔ تلاشی کے بہانے لوٹ مار کرتے۔ جسے چاہتے پکڑ کے لے آتے۔ جو چاہتے اٹھا لیتے۔ جس گھر کو چاہتے مسمار کر دیتے۔

شائستہ خان کی، باپ دادا سے چلی آتی وہ پیلی حویلی تھی۔ سنہری مسجد کے پاس، لال قلعہ کو جاتے ہوئے سیڑھیوں والی گلی میں، نکر پہ۔ کچھ لوگ اسے پیلی حویلی کہتے تھے کچھ نقاش حویلی۔ حویلی میں نسل در نسل نقاش رہتے آ رہے تھے۔ کبھی حویلی کے مکینوں کو شاہی تصویروں سے فرصت ملتی تو رنگ اور برش لے کر اپنی ہی حویلی کی دیواروں پہ چڑھ جاتے۔ پھول بوٹے، ہاتھی ہودے، چھتریاں، گھوڑے سوار، شاہی

سواریاں، تلواریں، کچھ اسی قسم کے ان کی تصویروں کے موضوع تھے۔ گلی میں چلتے پھرتے لوگ ان کی حویلی کے پاس آ کر ٹھہر جاتے تھے۔ پالکیاں ادھر رکوائی جاتی تھیں۔ ریشمی پردوں میں حنائی ہاتھ سرسراتے تھے۔ کاجل سے بھری چمکتی آنکھیں کمال ابرو اٹھا اٹھا اس حویلی کی دیواریں تکا کرتی تھیں۔ کھڑکیوں کی محرابیں، دروازوں کے ڈاٹ ہر جگہ نقش و نگار آنکھوں کو خیرا کرتے تھے۔ تصویروں کے رنگ پختہ تھے۔ بارشیں ہوتی، مینہ دنوں تک برستا رہتا۔ مجال ہے کسی پھول کی پتی سے بوند رنگ نکل جائے۔ کوئی گھوڑے پہ چڑھا سوار کاٹھی سے کھسک جائے۔ ہر چیز ہر موسم میں اپنی جگہ رہی۔ مگر غدر کے بعد دہلی کا موسم ہی کچھ ایسا بدلا کہ سارے شہر کا نقشہ بدل گیا۔ تصویروں سے رنگ نکل گئے۔ رنگوں سے جسم علیحدہ ہو گئے۔ درختوں سے پتے جھڑ گئے۔ کاٹھیوں سے سوار گر گئے۔ کندھوں سے گردنیں لڑھک گئیں۔ لاشے بے نام ہو گئے۔ ہر تصویر ایک ہی رنگ کی رہ گئی، خون رنگ کی۔ سنہری مسجد کے گرداگرد سجی سجائی حویلیوں سے بھرا پورا محلّہ گرا دیا گیا۔ چٹیل میدان کر دیا گیا۔ توڑے گرائے مکانوں کے ملبہ سے روز جنازے گزرا کرتے تھے وہ بھی خاموشی اور سراسیمگی کے عالم میں، کہ کوئی بلند آواز کلمہ شہادت کی آواز بھی نہ دے پاتا۔

شائستہ خان کے ساتھ چھ دن کیا ہوتا رہا، کسی کو علم نہیں، ساتویں دن اسے قطب مینار کے پاس پھانسی دے دی گئی۔ بڑا بیٹا بھی نقاش تھا۔ اسے جامع مسجد کی سیڑھیوں کے سامنے لگی پھانسی پہ چڑھایا گیا۔ سب سے چھوٹا بیٹا ہیضے سے مر گیا۔ منجھلا منہاج الدولہ بچ گیا۔ نواب شائستہ خان کی بیگم فخر النسا اسے لے کر کسی کھولی میں جا چھپی۔

کئی دن کئی راتیں چوہوں کی طرح اندھیری کوٹھری میں چھپ کے بھوکے پیاسے گزار دیں۔ وقت بدل گیا تھا۔ کہاں تو اس کے لیے لال قلعے سے ریشم، کمخواب کے موتی لگے پہناوے آتے تھے۔ کہاں وہ دوسروں کے گند بھرے میلے کپڑے دھونے لگی۔ برتن مانجھنے لگی۔ بیٹا دس سال کا تھا۔ راجکماروں کی طرح پلا تھا۔ ترکھان

کی دوکان پہ بٹھا دیا۔ وہ ادھر لکڑی کے تختوں میں میخیں ٹھوکنے لگا۔ تھوڑا ہوش سنبھالا تو تیشہ ہاتھ میں لے لیا۔ نقاش کا بیٹا تھا تیشہ ہاتھ میں آیا تو لکڑی میں بیل بوٹے اُگانے لگا۔ خون میں ملا رنگ پھیکا تھوڑی ہوتا ہے۔ نقاش لہو نقاشی کی طرف پلٹ آیا۔ وقت گزرتا گیا۔ بیگم فخر النساء بے نام سی اجڑی ہوئی عورت بن گئی تھی۔ نہ بیگم رہی نہ اسے کوئی فخر رہا، بس منہاج کی ماں اور گلی محلے کی ماسی بن کے رہ گئی۔ ایک کرائے کی کوٹھری میں رہ کے بیٹے کو پالتی رہی۔ بیٹا چار آنے کمانے لگا تو شاہجہان آباد سے پرے، لال قلعے سے کوئی دس میل دور، جہاں پناہ کی دیوار اندر، بیجائی منڈل اور بیگم پور مسجد کے درمیان کوچہ فدائیاں کی ایک تنگ سی گلی میں دو کمرے کا مکان لے کر رہنے لگی۔ یہاں اسے یہ سکون ملا کہ قطب صاحب کا مینار قریب تھا، جدھر اس کے شوہر شائستہ خان کو پھانسی پہ لٹکایا گیا تھا۔ وہ ہفتے میں ایک بار، ایک ہی چکر میں قطب صاحب کو سلام اور شائستہ خان کی پھانسی کی جگہ پہ جا دعا کر آتی تھی۔ مگر اندر ہی اندر اس کا دل کٹتا تھا کہ بڑے بیٹے کی گردن جدھر کھنچی تھی، وہ شاہی مسجد کی سیڑھیاں، لال قلعہ اس سے دور تھے۔

کوچہ فدائیاں میں فخر النساء نے زندگی کا وہ بھیانک رنگ دیکھا جو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا، یہاں وہ سنہری مسجد کے پڑوس والی نقاش پیلی حویلی کی بیگم صاحبہ نہیں تھی، جو پالکی میں بیٹھ کے نکلتی تھی۔ بگھی میں لوگ بیٹھ کے ان کے گھر سلام کرنے آتے تھے۔ عید، شب برات تانبے اور چاندی کے سکے مٹھیاں بھر بھر کے وہ خیرات کیا کرتی تھی۔ باورچی سات سات قسموں کے پلاؤ پکاتے۔ رکابدار تکلفات اور جدت طرازیاں کر کے دسترخوان سجاتے، بریانی، مزعفر، تنجن، شیرمال اور شیر برنج کے خوانچے سج جاتے۔ پستے اور بادام کی کھچڑیاں پکتیں۔ آبدار خانے میں جست کی صراحیوں میں پانی ٹھنڈا کرنے کے لیے ناندوں میں شورا ملے پانی میں جھلائی کی جاتی۔ پانی، برف ملے پانی کی طرح یخ ہو جاتا۔ دنوں تک گھر میں مرغوں کی پالی بجتی۔

اصیل مرغ پانچ پانچ دن قالینوں پہ لڑتے رہتے۔ بٹیروں کے لیے سبک کابکیں ہوتیں جن میں ہاتھی دانت کی گھمریاں بجی ہوتیں۔ چھتوں پہ گرہ باز اور گولے کبوتروں کے غول کے غول گٹرغوں گٹرغوں کرتے رہتے۔ چونے والیوں کے طائفے لے اور نرت کے منڈل لیے مردانے میں کئی کئی دنوں آ کے ٹھہرے رہتے۔ زنان خانوں سے پک پک کے پکوان جاتے۔

اب تو وہ مہینے بھر کی مزدوری کے بعد مٹھی میں چار سکے لے کر کمر خمیدہ چلتی چلتی گھر آتی تو اسے گزرے ہوئے دن، کسی پچھلے جنم کی داستان معلوم ہوتے تھے۔ ہاتھوں پہ پرائے جھوٹے برتن مانجھ کے رٹن پڑے تھے۔ جسم کی کھال غربت اور نقاہت سے لٹک گئی تھی۔ چہرہ جھریوں سے بھرا پڑا تھا۔ آنکھیں ایسی ویران کہ جیسے کسی حویلی کا کھنڈر ہوں جس سے سارے مکین نکل گئے ہوں۔ ایسے دنوں زندہ رہ کے اسے زندگی کی حقیقت کے وہ راز ملے جنہیں پہلے اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

اب اسے پتہ چلا کہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت صرف جینا ہے۔

جتنے سانس باقی ہیں انہیں پورا کرنا ہے۔

گھر بار کنبہ حویلی آن بان، شان سب کچھ گنوا کے بھی اس کے پاس جینے کو ایک آدرش تھا، یہ بہانہ اس کا بیٹا منہاج تھا۔ وہ اسی کے بچ جانے پہ آدھی رات اٹھ کے خدا کے حضور سجدہ شکر کرتی۔ دھیرے دھیرے اس کا بیٹا منہاج بڑا ہو گیا۔ محنتی تھا، ہنر مند تھا، اپنا آپ اس نے منوا لیا۔ اسے مزدوری اچھی ملنے لگی۔ بیگم فخر النساء نے اسی گلی میں، اپنے جیسے کسی لٹے پٹے گھر کی لڑکی سے بیٹے کا بیاہ کر دیا۔ ماں بیٹا گئے، ایک گٹھڑی میں دو جوڑے کپڑے لیے، بیگم فخر نے اپنے دوپٹے کی کنی میں ایک طرف چار لڈو باندھے، دوسری طرف سات سنگار چیزوں کی پوٹلی باندھی اور بارات بن کر پڑوس کی ایک کوٹھری سے بہو بیاہ کے لے آئی۔

بہو پیلی سی کمزور یرقان زدہ پندرہ سال کی لڑکی تھی۔ نام تھا عذرا۔ سہمی سہمی

خاموش، بڑی بڑی ویران سی پیلی آنکھوں سے حیراں حیران اپنے سسرال گھر کو تکتی رہتی۔ اچھے دنوں میں اس کا باپ ایک مدرسے کا عالم تھا۔ مسجد میں نماز پڑھاتا تھا۔ غدر میں قید ہوا تو پھر کوئی خبر ہی نہ ملی اس کی۔ عذرا کی ماں نے برسوں کے انتظار کے بعد اپنی کانچ کی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ عذرا کے چار بھائی تھے۔ دو فرنگیوں نے پکڑ کے مار دیئے۔ دو بیماری سے مر گئے۔ ایک کی گردن میں پھوڑا ہو گیا۔ سانس کی دقت سے مر گیا۔ دوسرے کو چار ہفتے بخار چڑھتا رہا، ویدوں، حکیموں کو سمجھ نہ آئی، پانچویں ہفتے وہ بھی مر گیا۔ عذرا کی ماں کی آنکھوں کا نور جاتا رہا۔ وہ گلی میں بچیوں کو سپارے پڑھاتی تھی۔ تنگ جاتی رہی تو وہ اس کام سے بھی گئی۔ اس کی اندھیری کوٹھری میں بیماری ایک یہی عذرا بچی تھی۔ بیگم فخرا سے اپنے بیٹے کے نکاح میں لے آئی۔ نکاح کے سوا مہینے بعد عذرا کی اندھی ماں کو جینے کا کوئی جواز نہ ملا، سکون سے بغیر کسی بیماری کے مر گئی۔ عذرا کو اس وقت پتہ چلا جب وہ اسے ملنے اس کی کوٹھری میں گئی تو عجیب سا ڈروانا سناٹا تھا۔ آوازیں دیں کوئی جواب نہ آیا۔ عذرا کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اندر اندھیرا تھا۔ چراغ جلا کے کپکپاتی ہراساں، اماں، اماں کہتی ہوئی عذرا کوٹھری میں گئی۔ سرسوں کے چراغ کی پھڑ پھڑاتی پیلی لو کالی کوٹھڑی کی ایک ایک دیوار پہ پھسلتی پھسلتی جب اس کی ماں کی چارپائی پہ گئی تو عذرا کے لرزتے ہاتھوں سے چراغ گرنے لگا۔ دیکھا، چارپائی پہ داہنے ہاتھ پہ پچکا ہوا سا گال رکھے، نابینا آنکھیں کھلی چھوڑے اس کی ماں مری پڑی تھی۔

عذرا کا سینہ پھٹ گیا۔

ہوش گم ہو گئے۔

وہ جلتا چراغ وہیں پھینک کے چیخیں مارتی ہوئی باہر بھاگی اور گلی میں غشی سے گر گئی۔ پڑوس والے نکل آئے۔ ساتھ ہی فخر النساء کا گھر تھا۔ فخر النساء کو کسی نے آ بتایا، تیری بہو روتی چیختی گلی میں گری پڑی ہے۔ بے ہوش ہے۔ وہ ننگے پیر، ننگے سر بھاگی،

ہائے میری بہو۔

عورتیں اکٹھی ہو گئیں۔ عذرا کو اٹھا کے ایک گھر کی ڈیوڑھی میں لٹا دیا۔ منہ پہ پانی کے چھینٹے مارے۔ ادھر پڑوس کے لوگ عذرا کی مری ہوئی ماں کے کمرے میں بھاگے، دیکھا چراغ نے دروازے کی چوکھٹ کو جلا دیا۔ پاس پڑے کپڑوں کی گٹھڑی سے شعلے اٹھ رہے تھے اور پیلی آگ کی روشنی میں دو قدم کے فاصلے پہ چارپائی پہ عذرا کی ماں مری پڑی تھی۔

عذرا کا اپنے سسرال کے سوا دنیا میں کچھ نہ بچا تھا۔ اس کی ساس فخر النساء بھی لٹی پٹی تھی۔ اس نے عذرا کو ایسے اپنے دل سے لگا لیا جیسے وہ اس کی کوکھ جنی ہو۔ منہاج اور عذرا کی شادی کے دوسرے سال میری نانی ارجمند بانو کا باپ لال خان پیدا ہوا۔ فخر النساء پوتے کو پالنے میں جت گئی۔ دو سال بعد ایک اور بیٹا پیدا ہوا۔ وہ سانولے رنگ کا تھا۔ اس کا نام کالے خان رکھ دیا۔

کسمپرسی کے دنوں میں بچوں کے نام تک والدین کی حیثیت کی چغلی کھاتے تھے۔

کہاں تو وہ دن تھے کہ ان کے خاندان میں نوابوں جیسے نام رکھے جاتے تھے۔ شائستہ خان، منہاج الدولہ اور اس وقت وہ دن تھے کہ بچہ پہلے دن جس رنگ کا نظر آیا۔ وہی اس کا نام پڑ گیا۔ منہاج کی ماں، فخر النساء دو لڑکوں کی دادی بن گئی۔ اس نئے رشتے نے کہنے کو اس کے گزرے دنوں کی زخم مندمل کر دیے۔ وہ دونوں بچوں کو سنبھالتی دوڑی پھرتی۔

بچے سنبھل گئے۔

بڑا گھر میں بھاگنے دوڑنے لگا، چھوٹا قدم قدم چلنے لگا تو فخر النساء کو دل کا کوئی عارضہ ہو گیا۔ بیٹھے بٹھائے دل ایک دم سے اچھلنے لگتا، سینے میں درد اٹھتا اور ٹیسیں بائیں کندھے سے ہوتی ہوئی بائیں کہنی تک جاتیں۔ وہ اپنا بائیاں بازو پکڑ کے سینے

کے بل جھک کے بیٹھ جاتی۔ چہرہ پیلا پڑ جاتا اور ماتھے پہ ٹھنڈے پسینے کے قطرے ابھر آتے۔ منہاج اپنی ماں کو ویدوں، حکیموں کے پاس لیے پھرتا۔ کہیں سے خمیرہ گاؤزبان لاتا، کہیں سے گلاب کا عرق۔ فخر النساء کو افاقہ نہ ہوا اور ایک دن وہ ڈیوڑھی میں گلی میں کھلے دروازے کے پاس دیوار سے ٹیک لگائے چپ چاپ مر گئی۔ عذرا گھر کے اندر تھی۔ ڈیوڑھی کے ساتھ کمرے کی کھڑکی سے باہر گلی میں سے گزرتی ہوئی کوئی ریشمی جھل مل میں سرسراتی، چار کہاروں کے کندھوں پہ اٹھائی ہوئی دیودار کی لکڑی کی بنی سجی سجائی پالکی دیکھ کے اپنی ساس کو دکھانے کے لیے ڈیوڑھی میں بھاگی آئی۔

اماں دیکھ، پالکی۔

جیسی تو اپنی بتایا کرتی تھی۔

دیکھ دیکھ نکل جائے گی۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ساس کے کندھے کو جو ہلایا تو ساس وہیں لڑھک گئی۔ عذرا سٹ پٹا کے ساس پہ جھکی تو دیکھا، بیگم فخر النساء کی آنکھیں دور گلی کا موڑ مڑتی ہوئی پالکی کی طرف مڑی ہوئی تھیں اور سینے سے سانس نکل چکا تھا اور اس کا بڑا پوتا لال خان گلی میں پالکی کے پیچھے پیچھے ننگے پاؤں بھاگا جا رہا تھا۔ عذرا نے بیٹے کو چیخ کے آواز دی۔

لال، لال بیٹا۔ آپ کی دادی چلی گئی۔

لال خان کو اپنے بچپن کا وہی پہلا واقعہ یاد تھا۔ وہ سوچنے بیٹھتا تو اسے اپنی ماں کی چیخ سنائی دیتی۔ جب وہ ریشمی جھل مل کرتے پردوں والی پالکی کے پیچھے گلی میں بھاگے جا رہا تھا، وہ پلٹ کے آتا تو اس کی ماں روتے ہوئے کہتی، لال بیٹا، تیری دادی چلی گئی۔

لال خان کی اس کے بعد کی یادیں ساری اپنے ماں باپ کی تھیں۔ منہاج الدولہ اور عذرا کی یادیں، اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی کالے خان بھی تھا۔ دونوں بھائی بڑے ہو گئے۔ اور اپنے ابا کے ساتھ کام پہ جانے لگے۔ ابا ہنر مند بڑھئی بن گیا

تھا۔ سارا دن دونوں بچے ابا کی دوکان پہ لکڑی پہ نقاشی کا کام سیکھتے۔ شام کو گلی کی ایک مسجد میں پڑھنے چلے جاتے۔ ان کے ابا منہاج الدولہ نے کچھ پیسے جمع کر لیے تو پرانا محلّہ چھوڑ کے دہلی دروازے کے باہر تین منزلہ گھر خرید لیا۔ جس کی چھت سے لال قلعہ سیدھا شمال میں نظر آتا تھا۔ اسی چھت کی داہنی طرف سے صبح کا سورج جمنا سے نہا کے نکلتا ہوا نظر آتا تھا۔ پورے دن دہلی کے گھروں میں دھوپ بانٹتا وہ سورج شام سمے اجمیری دروازے کے اندر گھس جاتا۔ منہاج الدولہ کو اپنے اس گھر کی چھت بہت پسند تھی۔ وہ اکثر وہاں کھڑا ہو کے لال قلعے سے اجمیری دروازہ تک ہر منظر بار بار دیکھتا رہتا۔ لال خان اس کا بڑا بیٹا تھا۔ اکثر وہ لال خان کو پاس بلا کے اپنے باپ شائستہ خان کی نقاش حویلی سے لے کر اپنی ماں کی ڈیوڑھی میں دیوار سے ٹیک لگائے لگائے مرنے کی ساری کہانی سنا دیتا۔ دادی کے مرنے کے بعد کی ساری کہانی تو لال خان نے بیتی تھی۔ پرانی کہانیاں بار بار سن کے لال خان کو پوری دہلی کی کہانی بھی اپنی بیتائی ہوئی لگتی تھی۔ کبھی کبھی وہ کام میں جتی ہوئی اپنی ماں عذرا کو چھت پہ دیکھ کے چاروں طرف پھیلی ہوئی دہلی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کرتا تھا۔

اماں! یہ دہلی کون ہے؟

اس کی ماں عذرا ہنس کے، دھلے کپڑے نچوڑتے ہوئے، انہیں پھٹک کے چھت پہ بندھی ڈوری پہ ڈالتے ہوئے کہتی، بیٹا! یہ تیری ماں ہے۔ یہ میں ہوں۔ تو مجھ سے پیار کرتا ہے۔ ہاں ماں بہت۔ وہ اپنی ماں سے لپٹ جاتا۔ پھر اس سے بھی پیار کرنا۔ میں اسی سے ہوں۔ تیری دادی بھی اسی میں ہے۔ تیری نانی اسی میں تھی۔ تیرے دادا نے پھانسی سے پہلے بند ہوتی آنکھوں سے جو منظر دیکھا تھا، وہ یہی دہلی تھی۔ یاد رکھو گے نا۔ میرے بیٹے۔

لال خان کو بچپن کی یادیں بہت عزیز تھیں۔

وہ اکثر اپنی بیٹی ارجمند بانو کو چھت پہ بٹھا کے شہر کی مختلف سمتوں میں اپنے

پرانے یادگار سفر دکھایا کرتا تھا۔ یہ وہی گھر تھا جو اس کے باپ منہاج الدولہ نے اپنی محنت سے پائی پائی جمع کر کے خرید اتھا۔

ادھر دیکھ۔

وہ ارجمند بانو کو کہتا۔

وہ لال قلعے کے آگے جامع مسجد، چاندنی چوک سے ہوتا ہوا ادھر میرا باپ مجھے لے جاتا تھا۔ فیروز آباد کے بیچ سے گزر کے پرانے قلعے کو جمنا کی طرف چھوڑ کے، ہمایوں کے مقبرے کے آگے سے گزرتے سیدھے ہم درگاہ نظام الدین اولیاءؒ پہ پہنچتے تھے۔

ابا کئی بار جا چکے ہیں ہم آپ کے ساتھ، ادھر۔ ارجمند بانو کہتی۔

ہم اپنے بچپن کے سفر کی کہانی سنا رہے ہیں، بیٹی۔ جب ہمیں ہمارے امی ابا لے کر جاتے تھے۔ ایک بار ان دونوں نے وہاں جا کر ایک منّت مان لی۔ یہ کہہ کے لال خان ایک لحہ کو چپ ہوا، پھر بولا، تمہارے دادا دادی کی بات کر رہا ہوں۔ عجیب منّت مان لی انہوں نے۔ اکٹھی، خواجہؒ کی درگاہ پہ، ہم دونوں بھائی ساتھ تھے۔ ہم نے منّت سن لی اور بعد میں خوب ہنسے۔ لال خان یہ کہتے کہتے آبدیدہ ہو گیا۔ آنسو اس کی دونوں آنکھوں میں ایک دم سے بھر گئے پھر ٹپ ٹپ کر کے، اس کے گالوں کو چھوئے بغیر زمین پہ گرنے لگے۔

ابا، آپ ہنسنے کی بات کہہ کے رونے لگے ہیں؟

ارجمند باپ سے لپٹ کے بولی۔

ہاں بیٹا! بڑی عجیب منّت تھی۔ مانی وہ میری ماں نے تھی، ابا نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی۔

منّت کیا تھی۔ ابا، ارجمند نے آہستگی سے پوچھا، جیسے اسے ڈر ہو، اسے بتاتے بتاتے ابا اور روئے گا۔ وہی ہوا منّت بتاتے بتاتے لال خان کی ہچکی بندھ گئی۔ گردن

کے اکڑے پٹھوں کو سہلا کے آنسو پونچھے بغیر وہ بولا۔

ماں کہنے لگی خواجہ نظام الدینؒ سے۔

نظام خواجہؒ ہمارے بیٹے بیاہے گئے تو ہم ایک ہفتہ تیرے پاس آ کر تیری سیوا کریں گے۔ جھاڑو دیں گے ادھر۔ تیرے ملن کو آئے مہمانوں کو کھانا کھلائیں گے۔ پانی پلائیں گے۔ تیرے گھر کو چمکائیں گے۔

میرے ابا، منہاج الدولہ، اماں کی یہ باتیں سن کے ہنسنے لگے۔ اماں ابا کا بازو کھینچ کے بولیں۔ ہنس کے بات نہ ٹالیے، ہم نے خواجہ جیؒ سے وعدہ کرلیا ہے آپ کی طرف سے بھی۔ آپ دوٹوک ہاں کیجیے اب۔ میرے ابا ایک دم سنبھل کے کھڑے ہو گئے۔ اور سینے پہ ہاتھ رکھ کے بولے۔

وعدہ ہے ہمارا بھی آقا خواجہؒ۔

اتنا کہہ کے لال خان چند لمحوں کے لیے چپ ہو گیا۔ اس کے چہرے کے عضلات بند مٹھی کی طرح کھلنے بند ہونے لگے۔ آنکھوں میں ایکا ایکی پھر آنسو بھر گئے۔ وہ رک رک کے زور زور کا سانس اندر کو کھینچ کے چھوڑنے لگا اور ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے گئے۔

ابا، کیا ہوا؟ منت ماننے سے کیا ہوا؟

ارجمند بانو باپ کے جھکے کندھوں کو دونوں ہاتھوں سے تھام کے پوچھنے لگی۔

لال خان بولا، بیٹا! بڑی انہونی ہوگئی۔

اس بات کو سات دن ہی گزرے تھے کہ میری ماں مرگئی۔ باپ اکیلا رہ گیا میرا۔ ساری عمر پھر وہ کبھی خواجہؒ کی درگاہ پہ نہیں گیا۔ جاتا تھا، باہر بڑے دروازے کی دہلیز پہ جا کے بیٹھ جاتا۔ روتا رہتا۔ کہتا خواجہؒ آقا ہم دونوں نے اکٹھے تیری سیوا کرنے کا وچن دیا تھا۔ اب اکیلے میں کیا کروں۔ سارے کام تو عذرا کو آتے تھے۔ میں تو دو ٹکے کا ترکھان ہوں۔ ساری عمر کیلیں ٹھوکتا رہا، اب میرے سینے میں میخ لگی ہے تو دل کو

کچھ سوجھتا ہی نہیں، کیا کروں۔ کدھر جاؤں۔

ابا سے پھر دل جمعی سے کچھ کام نہ ہوا۔ وہ ریزہ ریزہ ہو گئے۔ ٹوٹ پھوٹ گئے۔ اماں کا مرنا ہی کچھ ایسا تھا۔ کسی کو سمجھ ہی نہ آئی ہوا کیا۔ اچھی خاصی صحت تھی اماں کی۔ روزانہ گھر سے ہم باپ بیٹوں کے لیے دوپہر کا کھانا پکا کے، ناشتہ دان میں رکھ کے، ساتھ گھی سے نچڑتے ہوئے پراٹھے پکا، پوریاں تل کے وہ دوکان پہ لاتیں۔ جتنی دیر تک ہم کھاتے رہتے سامنے بیٹھی رہتیں۔ گلاس بھر بھر پانی کے ہمیں دیتیں۔ کئی بار ابا نے کہا، آپ جائیے ہم بعد میں کھالیں گے۔ مجال ہے اماں جو گئی ہوں۔ نہ، اپنے سامنے کھانا کھلوا کے خالی برتن وہیں دوکان کی نکر کے نلکے سے دھو کر، توش دان میں باندھ کے لوٹتیں۔

اُس دن بھی ایسا ہی کیا۔

ہمیں کیا پتہ تھا اماں آخری بار کھانا لے کر آئی ہیں۔

مولی کے پراٹھے، آلو کی بھجیا اور سوجی کا حلوہ تھا۔ ابا خفا ہوئے کہ اتنی چیزیں لے آئی ہیں، اب کیسے کھائیں، آپ کو سامنے بٹھا کے۔ اماں ہنستی ہوئی اٹھیں اور بولیں لو سامنے سے ہٹ جاتی ہوں۔ آپ کھائیے تو سہی۔ ابا نے ایک دم سے نوالہ رکھ دیا۔ بولے، ایک نوالہ نہیں اترے گا بنا آپ کو دیکھے۔ تشریف رکھے رکھیے۔ اماں ہنستی ہوئی پھر بیٹھ گئیں اور بڑے غور سے میرے ابا کو دیکھ کے بولیں، لال خان کے ابا، لال خان بھی جوان ہو گیا۔ آپ اپنی باتوں سے نہ ٹلے۔ کیوں ٹلوں بھئی۔ ابا بولے۔ لال خان جوان ہو گیا بسم اللہ۔ ہم کون سے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ اماں نے چادر سر سے کھینچ کے دانتوں میں اس کا ایک پلو لے لیا اور ہنس کے بولیں۔

داڑھی آدھی سفید ہو گئی۔

ٹوپی کے نیچے سفید جھالر ہے سر کی۔

لیکن باتیں وہی رہیں۔

پھر ہماری طرف دیکھ کے بولیں، دیکھ رہے ہو لال میاں آپ کے ابا پہ کیا رنگ چڑھتا جا رہا ہے۔ ہم آپ کی شادی کا سوچ رہے ہیں کہ گھر میں بہو لائیں، آپ کے ابا کو سسر بنائیں۔ اب دیکھیں آپ کے ابا سسر بن کے کیسے لگتے ہیں؟

ایسے ہی لگیں گے ہم تو جی، خطرہ تو آپ سے ہے کہیں ساس بنتے ہی، آپ کو ادھیڑ عمری کا وہم نہ ہو جائے!

لو اب ادھیڑ پنا تو سامنے ہے، اسی لیے کہتی ہوں، خواجہ نظامؒ کی درگاہ پہ باندھی ہوئی منت پوری کرا دیں۔ لال خان کے سر پہ سہرا باندھیں اور چل کے سات دن ادھر جھاڑو دیں۔

بھئی ہم تو تیار ہیں، بیٹے سے پوچھ لیں۔

ابا میری طرف مڑے،

میں ہنس کے دور جا کے بیٹھ گیا۔ اسی طرح ہنستے مزے مزے کی باتیں ہوتی رہیں۔ کسی کو خبر ہی نہ تھی کہ اماں سے یہ آخری باتیں ہیں ادھر بیٹھ کے۔ واپسی پہ انہوں نے کھانے کے برتن لیے۔ پانی سے دھوئے، کپڑے میں باندھے اور چلی گئیں۔ اپنی گلی میں پہنچی تو پیچھے سے ایک بھاگتے آتے لمبے سینگوں والے بیل نے ایسی ٹکر ماری کہ اماں اچھل کے گلی کی دوسری طرف لالہ دھنی رام کے اینٹوں کے پکے تھڑے پہ جا گریں۔

لوگ اکٹھے ہو گئے۔ لالہ دھنی رام نے اپنا بیٹا ہماری طرف دوڑایا۔ بیل بھاگ گیا۔ پڑوسی اٹھا کے اماں کو گھر لے گئے۔ کوئی وید بلا لایا۔ حکیم جی بھی پہنچ گئے۔ ہم تینوں باپ بیٹا بھی بھاگم بھاگ جا پہنچے۔ ہمارے تو وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ خبر سن کے بھی ابا یہی سمجھے کہ کوئی معمولی چوٹ آئی ہو گی۔ وہاں پہنچے تو صورت حال ہی کچھ اور تھی۔ ظالم بیل کے سینگوں سے ضرب ایسی آئی کہ بائیں طرف کا گردہ پھٹ گیا۔ پندرہ دن تک پیشاب میں خون آتا رہا۔ سولہویں دن پیشاب آنا

بھی بند ہو گیا۔ سترھویں دن اماں مر گئیں۔

ہمارا گھر پھر ایسے اجڑ گیا۔ جیسے غدر کے بعد دہلی اجڑی تھی۔

لال خان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

ہمارا گھر اماں سے جنت بنا ہوا تھا، آناً فاناً ویرانہ بن گیا۔

ہر کوئی بکھر گیا۔

اماں کے بعد ابا سے کام نہ ہوا کوئی بھی۔ ہم دونوں بھائی دوکان پہ چلے جاتے۔ وہ سارا سارا دن خالی گھر میں قید کسی چیخ کی طرح در و دیوار کو ویران نظروں سے گھورتے رہتے۔

دنوں میں سر اور داڑھی کے بال پورے سفید ہو گئے۔ داڑھی بے ربط ہوئی رہتی، مونچھیں بے ہنگم ہو گئیں۔ چہرے پہ میلی داڑھی مونچھیں اور بغیر ٹوپی کے بکھرے بال دیکھ کے، ایسا لگتا تھا جیسے وہ سر سے فرش صاف کرتے پھرتے ہوں۔ کپڑے میلے، پاؤں میں جوتی ندارد۔ اندر باہر سے ایک دم ٹوٹ گئے۔ ریزہ ریزہ ہو گئے کشمیری دروازہ بن گئے جس پہ ایک ساتھ پچاس توپیں داغی گئی ہوں۔ گھنٹوں گھر بیٹھے اپنے آپ سے باتیں کرتے رہتے۔

ادھر تخت پہ بیٹھی تیری اماں ہاتھ میں سروتا لیے میرے لیے سپاری کاٹا کرتی تھی۔

وہ اس کا اگالدان پڑا ہے۔

کتھے کی ڈلیاں ابھی تک سلی ہوئی تھیلیوں میں پڑی ہیں۔

کوئی نہ انہیں اٹھائے،

وہ خفا ہو گی۔

کبھی بھگوئے چونے کی کیتلی کا ڈھکن اٹھا کے دیکھتے۔ اور کہتے عذرا چونا بجھ گیا۔ اب لگا لو پان پہ۔

مجھے پان کون لگا کے دے گا۔

ہم اچھے سے اچھا پان لگوا کے لاتے۔ نہ کھاتے۔ کہتے بس عذرا کھلا گئی پان، جو کھانے تھے۔ کسی کو لگانا ہی نہیں آتا پان۔ جیسا تمہاری ماں لگاتی تھی۔ برابر کا چونا اور کتھا۔ سپاری ایسی کاٹتی تھی کہ منہ میں رکھتے ہی گھل جاتی تھی۔ مجال ہے جو داڑھوں پہ زور پڑے۔ بیٹھے پہروں لیں اماں سے باتیں کرتے رہتے۔ ہم بہتیری منتیں کرتے۔ ابا چلیں دوکان پہ۔ آپ کا دل بہلے، دھیان بٹے، وہ ڈانٹنے لگتے۔

تیری ماں ایسی ہستی تو نہ تھی جس سے دھیان ہٹایا جائے۔

جائیے اپنا کام کیجیے۔

ہمیں جس دھیان میں ہونا چاہیے، اسی میں ہیں۔

کبھی اڑوس پڑوس کے بچوں کو پکڑ لاتے۔

پوچھتے۔

ہمیں بتاؤ تو سہی، ہماری بیگم کدھر گری تھیں، کدھر سے بیل آیا تھا۔

ہمیں کہتے، بڑی چوٹ آئی تھی عذرا کو۔ سولہ دن درد کی شدت کو دباتی رہی۔ اُف نہ کی۔ جب ہم پوچھتے، بیگم کیسی ہیں۔ یہی کہتیں، ہم ٹھیک ہیں۔ الٹا ہم سے پوچھنے لگتیں، آپ نے کھانا کھا لیا؟ گلوری کسی نے لگا کے دی؟ لو، اینٹوں میں جڑی ہوئی لیٹی تھیں، کولہے کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں تھیں، گردہ پھٹا ہوا تھا۔ نبضیں ان کی مدھم ہوتی جارہی تھیں۔ چہرہ ہلدی جیسا ہو گیا تھا۔ بولا نہیں جاتا تھا۔ بولتیں تو یہی کہتیں۔ آپ نے کیا کھایا ہوگا۔ ہمیں کھینچ کے رسوئی تک لے جائیے۔ لیٹے لیٹے دو پھلکیاں ہی آپ کو پکا دوں۔ سولہویں رات سے ان پہ غشی کے دورے آ گئے۔ پھر نہیں بولیں تمہاری اماں۔ بس سترھویں دن میں پہلو میں کھڑا تھا۔ وید پاس بیٹھا نبض ٹٹول رہا تھا کہ چلی گئیں۔ میں تو کتنی دیر یہی سمجھتا رہا کہ مجھے تاکے جارہی ہیں۔ اسی لیے تو میں کھڑا رہا۔ دل میں خوف بڑھ رہا تھا کہ یہ بیگم کیوں ٹکٹکی لگائے دیکھے جارہی ہیں ہمیں۔

بس دیکھتی رہیں۔

حکیم صاحب نے نبض چھوڑ کے کلمہ شریف پڑھنا شروع کر دیا۔
پھر ہم نے چیخ ماری۔
کیا ہوا حکیم صاحب، بیگم تو تک رہی ہیں ہمیں۔
ہاں منہاج، وہ آپ پہ اپنی آنکھیں رکھ گئیں ہیں۔
خود چلی گئیں ہیں۔
یہ کہہ کے حکیم صاحب نے بیگم کے پپوٹوں کو چھو کے ان کی نظروں سے ہمیں ہٹا دیا مگر ان کی آنکھیں ہمیں آج بھی اسی طرح تکتی ہیں۔ انہوں نے نگہ نہیں ہٹائی وہ تو حکیم صاحب نے درمیان میں کلمہ شریف پڑھ کے ہاتھ رکھ دیا۔ ہمیں اسی طرح تکے جا رہی ہیں بیگم۔ یہیں، ہم کیسے اس گھر سے نکلیں۔
خود چلی گئیں۔
اپنی آنکھوں کا تکنا چھوڑ گئیں۔
میں اکیلا کیسے نظامؒ کے در پہ جاؤں۔
آقا نظامؒ ہم نے اکٹھے آ کے تیری درگاہ پہ جھاڑو دینا تھا۔
جھاڑ پونچھ کرنا تو اسے ہی آتا تھا۔
اسے ہی بلاوا آ گیا۔
میرے لیے کب حکم ہے۔
ابا، گھنٹوں بیٹھے خود کلامی کرتے رہتے۔
ہم دونوں بھائیوں نے دوکان سنبھال لی۔
گلی محلے کے لوگوں نے ابا سے بات کی۔ منہاج الدولہ کب تک تنور کی روٹیاں اور بازار کی دال کھائیے گا۔ سمجھدار بیٹے ہیں آپ کے جوان۔ ان کے بیاہ کر کے اپنی بہوئیں لائیے۔ گھر میں چولہا جلے۔
اماں کی ایک خالہ زاد بہن لکھنو کی تھیں۔ اماں کی وفات پہ وہ آئیں۔ پتہ چلا ان

کی چھ بیٹیاں ہیں۔ میاں ان کے علی گڑھ میں سرسید کے مدرسے میں منشی تھے ایک ایک کر کے پانچ بیٹیاں بیاہ چکی تھیں۔ چھٹی ہماری قسمت میں لکھی تھی۔ اماں کے چہلم پہ وہ آئیں تو بیٹی ان کے ساتھ تھیں۔ کچھ دن ہمارے ہاں ٹھہریں۔ ابا کو تو کوئی ہوش نہیں تھی، ہمارے سامنے والے پڑوسی لالہ دھنی رام کی بیگم نے ان سے بات کی ہمارے لیے۔ خالہ مان گئیں، اماں کی وفات کے تیسرے مہینے ابا ہمیں لے کر علی گڑھ گئے اور بیاہ کے لے آئے۔

چاند بیگم، آپ کی اماں نے تھوڑے ہی دنوں میں گھر کا نظام سنبھال لیا۔

آپ کی طرح پتلی کومل سی تھیں جب بیاہی آئیں بیگم ہمارے گھر۔ دیکھنے میں نحیف و کمزور لگتی تھیں کام میں چست۔ ہانڈی روٹی، سلائی کڑھائی، صفائی ستھرائی ہر کام میں تیز، سگھڑ۔ انہوں نے دنوں میں الٹے ہوئے سارے گھر کو سنوار دیا۔ ابا بھی سنبھل گئے۔ بوڑھے ہو گئے تھے۔ بیگم کام میں جتی رہتی۔ ابا اپنی بہو سے باتیں کرتے رہتے۔ اس سے کہنے لگے اب چھوٹے میاں کے لیے بھی اپنے جیسی جورو ڈھونڈ کے لاؤ۔ اس نے اپنے ہی محلے میں بات کر لی۔ پچھلی گلی میں رنگ سازوں کی بیٹی ساحرہ اسے پسند آ گئی۔ پہلے بیگم نے ہم سے بات کی، ہم نے کہا، دیور سے پوچھو ہم سے کیا پوچھتی ہیں۔ اس نے پوچھ لیا۔ کالے خان نے حامی بھر لی۔ لڑکی اس کی دیکھی ہوئی تھی۔ محلے داری تھی۔ کئی بار اس گلی سے منہ میں پان دبائے گزرے تھے، کالے میاں۔ بیگم نے پھر ابا سے بات کی۔ ابا نے تو گھر کی چابیاں بیگم کو دی ہوئی تھیں۔ بولے۔ اب تیرا ہر فیصلہ قبول ہے۔ لو جھٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا۔

کالے میاں کی دلہن ساحرہ بھی گھر میں آ گئی۔ اوپر کے دو کمرے کالے میاں اور اس کی دلہن کو دے دیے۔ کاروبار چلتا رہا اسی طرح سانجھا۔ جو کماتے لا کے ابا کے ہاتھ پہ رکھ دیتے۔ ابا اسے اٹھا کے ہماری بیگم چاند کے ہاتھ میں دے دیتے۔ وہ سارا گھر کا نظام چلاتی رہتی۔ لکڑی میں نقش و نگار تو ہم بناتے ہی تھے۔ ٹھپائی کا رنگ رنگنے

والے کئی کارخانے دار ہم سے ٹھپائی کی لکڑی کی مہریں بنوایا کرتے تھے۔ ان کا کام اچھا تھا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ ٹھپائی میں اصل کام تو انہی مہروں سے چلتا ہے۔ دوسروں کو جو مہریں بنا بنا کے دیتے ہیں۔ اپنا ہی ایک کپڑے رنگائی کا کارخانہ لگالیں۔ میں نے ابا سے مشورہ کیا۔ انہوں نے کیا اعتراض کرنا تھا۔ ہم نے آپ کی اماں کے کچھ گہنے بیچے اور ایک احاطہ زمین لے کر اس میں کارخانہ لگالیا۔

دنوں میں ہمارا کام چل نکلا۔

ابا تو ہمارے کارخانے کبھی نہ آئے، کالے خان بھی کارخانے سے کترانے لگا۔ ان کی بیگم ساحرہ رنگ ساز کی بیٹی تھی۔ ان کے کہنے میں آ کر انہوں نے رنگائی کے لیے الگ ایک جگہ بنالی۔ ہم نے سوچا یہ جیسے خوش ہیں وہ کریں۔ ہماری بیگم بھی ان کی خوشی میں خوش رہیں۔ ابا بے خبر، بس صبح مسجد گئے۔ نماز پڑھ آتے۔ دن بھر گھر میں پڑے رہتے۔

شام سے خواجہ نظامؒ کے دروازے پہ جوتیوں کے پاس جا بیٹھتے۔

اماں کو مرے دو مہینے اوپر سال ہو گیا۔ ابا کا معمول نہ بدلا۔

منت سات دن کی تھی انہوں نے مہینوں نظامؒ کی جوتیاں سیدھی کیں۔

گھر کا نظام چلتا رہا۔ ہماری شادی کو کوئی گیارہ مہینے ہوئے تھے کہ اللہ نے ہمیں بیٹی دے دی۔ آپ پیدا ہو گئیں۔ ارجمند بانو نام، آپ کے دادا کا رکھا ہوا ہے۔ صبح فجر کی اذان کا وقت تھا کہ آپ پیدا ہوئیں۔ آپ کے پیدا ہونے کے ڈیڑھ مہینے بعد ابا کوچ کر گئے۔ بیمار نہیں تھے۔ کمزور اور ناتواں تھے۔ اس دن کہنے لگے درگاہ نظام الدین اولیاءؒ جانا ہے، چلے گئے۔ شام کو واپس آئے۔ کسی سے کوئی بات نہ کی۔ نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ بیگم دو تین بار کھانا لے کر گئی۔ ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ سونے سے پہلے بیگم نے ضد کر کے دودھ کا گلاس پلا دیا۔ سو گئے۔ صبح اٹھے ہی نہیں۔ اٹھایا تو دیکھا فوت ہو چکے ہیں۔

چلیے نیچے آپ کی اماں آواز دے رہی ہیں آپ کو۔ہم سے تو ان کی بات نہیں ٹالی جاتی بھئی۔انہی کے کہنے میں آ کے آپ کا بیاہ علی گڑھ میں کیا تھا۔کبھی آپ کو آپ کے بیاہ کی کہانی بھی سناؤں گا۔کہانی کیا ہے،شطرنج کھیل رہے تھے ہم مردانے میں،آپ کی اماں چاند بیگم آ گئیں۔ہم شطرنج ہارتے ہارتے آپ کو ہار گئے۔

ارجمند بانو سیڑھیاں اترتی اترتی یہ بات سن کے رک گئی اور مسکراتی ہوئی حیراں حیراں آنکھیں کھول کے بولی۔ابا شطرنج میں مجھے ہار گئے۔ہیں یہ کیسے؟

سناؤں گا آپ کو،آپ کی ساری کہانی۔لال خان نے بیٹی سے کہا اور سیڑھیاں اتر گیا۔

□

شطرنج نصیب

پتہ نہیں لال خان نے ارجمند بانو کو وہ کہانی سنائی یا نہیں، میں تمہیں سناتا ہوں۔
ہوا یوں کہ ایک دن لال خان کو درمیانی عمر کا اکہرے بدن، گنجے سر اور گوری پھیکی سی رنگت کا ایک بے حد باتونی شخص ملنے آ گیا۔ لال خان سے اس شخص کی چند ایک ملاقاتیں تھیں۔ مگر جان پہچان نسلوں پرانی تھی۔ علی گڑھ سے وہ کسی کام سے دہلی آیا تو لال خان سے ملنے اس کے گھر پہنچ گیا۔

اس کا نام صفدر میر تھا۔

آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور بے حد متحرک تھیں اور اس کے چہرے مہرے پہ کچھ ایسا تاثر تھا جیسے ان بچوں کے چہرے پہ ہوتا ہے، جنہیں سنا کم گیا ہو، مگر وہ بولنا زیادہ چاہتے ہوں۔ جنہیں اپنے آپ کو منوانا باقی رہ گیا ہو۔ اور انہیں اس بات کا پتہ بھی ہو۔ یوں ایک سادگی، حیرت، اچنبھے، تذبذب، شور اور اداسی سے بھری ہوئی کنفیوژ سی ان کی شکل دکھائی دیتی ہو۔ ایسی شکل تھی صفدر میر کی۔

ایک دن کے لیے وہ لال خان کے گھر ٹھہر گیا۔

سہ پہر کا وقت تھا کہ مہمان خانے میں دونوں، دوپہر کے کھانے کے بعد شطرنج کی بساط بچھا کے بیٹھ گئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ بالکونی دبیز پہ پردے پڑے تھے۔

اندر کمرے میں چکنی کالی سفید شطرنجی لکڑیوں کے پتھروں کا ٹھنڈا فرش تھا۔ وہ دونوں گاؤ تکیے کہنیوں کے نیچے اور کمر کے پیچھے رکھ کے وہیں بیٹھ گئے۔ حقہ پاس رکھ لیا ساتھ ہی ایک طشتری میں مشک اور زعفران سے چھوئی ہوئی جوء کے دانوں جیسی نفیس باریک کتری ہوئی چھالیا رکھ لی۔

آبدار خانہ پاس پڑا تھا۔

ٹھنڈی، تانبے کی صراحی ایک ناندے میں مٹھی بھر شورا ملے پانی میں ڈال کے رکھی ہوئی تھی۔ درمیان میں، شیشم کی پرانی کالی لکڑی سے بنے شطرنج کے ڈبے کو کھول لیا جس پہ سفید گھروں میں ہاتھی دانت کا جڑاؤ کام ہوا ہوا تھا۔ مہرے دیودار کی لکڑی سے تراشے ہوئے تھے۔ سفید مہرے لال خان کے تھے کالے صفدر میر کے۔

شطرنج کی بازی چل رہی تھی۔

قصے کہانیاں بھی ساتھ چلے جا رہے تھے۔

دونوں کی ایک دوسرے سے پچھلی کئی نسلوں سے شناسائی تھی۔ دونوں کے دادا پرانے وقتوں میں ساتھ رہے تھے۔ غدر میں فساد برپا ہوئے تو دونوں خاندان جدھر سینگ سمائے ہو لیے۔ برسوں بعد کہیں ان کی ملاقات ہوئی تو دونوں پرانے دفتر کھول کے بیٹھ گئے۔ درمیان میں شطرنج سجالی۔ منہ میں چھالیا رکھتے، حقے کے کش لیتے اور باتیں کرتے جاتے۔ کچھ مکالمے اس طرح کے بھی ہوئے تھے شاید۔ یا ہونے چاہئیں تھے۔

شطرنج تو غدر میں بھی بڑی چلی تھی۔

پیادوں نے شاہ کو شہہ دی تھی۔

شاہ تو مات ہوا بساط سے باہر پڑا تھا۔ اسے شہہ دینے کی کیا ضرورت تھی۔

پھر بازی کیسے پلٹی۔

وہ تو شاہ پہ الزام تھا کہ اس کی شہہ پہ پیادے قلعوں سے جا بھڑے۔

پیادے قلعوں کی زد سے نکل کے بھاگے تو سمجھے، قلعے روندے گئے۔
ایسا تھوڑی ہوتا ہے۔
پیادے بیچارے تو یک رخی قوم ہیں۔
جدھر رخ ہو گیا، ہو لیے۔
پیچھے تھوڑی پلٹ سکتے ہیں وہ۔
وہ تو ایک آدھ قدم کی بات تھی، جب تک قلعے ان سے ترچھے رہے بچے رہے۔
قلعوں نے رخ بدلے۔
فیلوں نے سیدھ میں ان کو لیا تو اک اک کرتے گرتے گئے۔
تھے بھی سارے بے زورے۔ مگر سمجھ بیٹھے تھے کہ زور آور ہیں۔
ایسے نا سمجھ بے زور آور پیادوں میں یہی نقص ہوتا ہے کہ وہ کسی کا زور نہیں لیتے، نہ کسی کو زور دیتے ہیں۔ آگے چلنے کے زعم میں انہیں یہ خیال ہی نہیں رہتا کے پیچھے، دائیں یا بائیں سے وہ کس کی زد میں آ گئے ہیں۔
آ گئے، زد میں۔
مارے گئے۔
وہ شطرنج کی بازی نہیں تھی۔
شطرنج تو کھیلی جا چکی تھی۔
شہہ بھی ملی تھی۔ مات بھی ہوئی تھی۔ پٹے مہرے کسی نے بے احتیاطی سے اٹھا کے کالے سفید خانوں میں رکھ کے ان سے کاٹا کاٹی قسم کی کھیلیں کھیلنی شروع کر دی تھی۔ ان سے بھی بچھی بساط کے گھروں کے کونے نہ دبوچے گئے۔ جو پہنچ گئے انہوں نے پلٹ کے اک اک کو دبوچ لیا۔ پٹے ہوئے شاہ کے پیادے بساط پہ دوڑنے لگیں تو بساط تھوڑی بچھی رہتی ہے۔ الٹ دی گئی۔
''باری آپ کی ہے'' صفدر میر کو سوچتے دیکھ کے لال خان نے کہا۔

"بھئی ہم تو یہ سوچ رہے ہیں میاں لال خان، کہ آپ نے نسل درنسل دہلی میں رہ کے بھی دہلی سے کچھ نہ سیکھا۔ وہی غلطی کی جو یہاں لال قلعے کے ہر شاہ سے ہوئی۔ لیجیے اب سہیں صدمہ۔ یہ کہہ کے صفدر میر نے لال خان کے شاہ اور وزیر کو ایک ہی ترچھی سیاہ قطار میں کھڑے دیکھ کے اپنے ایک پیادے کے زور پہ اپنا سیاہ فیل اٹھا کے بادشاہ کے سامنے رکھ دیا اور بولا۔

شہ نکالیے اور وزیر پہ فاتحہ پڑھ لیجیے۔

لال خان سٹ پٹا گیا۔

زیرِ لبی بولا۔ "یہ کیسے ہو گیا۔"

صفدر میر نے فاتحانہ انداز میں کہنی کے نیچے رکھے گاؤ تکیے کی زربفت کی گوٹ کو داہنے ہاتھ سے مسلا اور کمر کے پیچھے پڑے تکیے پہ کمر کا دباؤ ڈال کے دراز ہوتے ہوئے گردن لمبی کی، پھر سر سے کھسکتی ہوئی رومی ٹوپی اتار کے اپنی چندیا پہ طبلے کی طرح بائیں ہاتھ کی انگشت شہادت اور باقی پوروں کو کسی طربیہ لے میں بجاتے ہوئے سر کو خوشی سے ہلاتے ہوئے بولا۔

حضرت ہر پٹنے والی سپاہ کے شاہ یہی کہتے ہیں۔

ہائیں یہ کیسے ہو گیا۔

وہ اپنی دونوں کہنیاں پھیلا کے گاؤ تکیے کے گرد ہاتھوں کی مٹھیاں بنا کے اپنے سینے کو دونوں انگوٹھوں کی پشت سے ہولے ہولے چھوتا ہے اور جی کھول کے خود کو داد دیتا ہے۔ پھر وہیں دراز ہوئے ہاتھ بڑھا کے حقے کی نَے کھینچ کے منہ کو لگاتا ہے، جیسے اپنے آپ کو انعام دے رہا ہو۔

اجی حقہ ذرا ادھر لائیے۔ آپ نے تو چکرا دیا۔ لال خان سنبھل کے بیٹھتے ہوئے حقے کی نَے پکڑتا ہے۔

حضرت حقہ لے لیجیے، مگر جس چکر میں آپ آ چکے ہیں، حقہ نکال نہ پائے گا۔

بھئی حد ہو گئی۔ آپ نے باتوں میں لگا کے ہمارے سپہ سالار ہی گرا دیے۔
باتوں میں لگا کے ہی سپہ سالار گرائے جاتے ہیں حضور۔
یہ تو حضرت چالاکی ہے۔
حضور! ایسے سپہ سالار، سیناپتی کا گرنا عین حق ہے جو باتوں میں لگا رہے یا اپنے ہی شاہ پہ ترچھی نگاہ رکھے۔

اجی سیدھے قطار میں رکھے ہوتے دونوں، تو آپ برج سر پہ لے آتے۔ اب سوچنے بھی دیجئے۔

سوچنا کیا ہے عالی جاہ۔ سلام کا مقام ہے پڑھیے اور گزر جائیے۔ شاہ کے پاس دو قدم ہیں چلنے کو، درمیان میں کوئی بانکا تو آنے سے رہا۔ سوچنے کو آپ پہروں سوچتے رہیے۔ صفدر میر یہ کہہ کے اطمینان سے طشتری سے چھالیا کی چٹکی اٹھا کے منہ میں رکھ لیتا ہے اور بے حد آسودگی میں جبڑے گھمانے لگتا ہے۔

لال خان حقے کی نے منہ میں دیے بغیر گڑگڑائے بیٹھا سوچ میں ڈوبا ہوتا ہے، باہر دروازے پہ ہولے سے دستک ہوتی ہے ساتھ ہی کلائی پہ چڑھی کانچ کی چوڑیاں چھنکتی ہیں اور ادھ کھلے دروازے کی کنی پہ حنائی ہاتھ کی گوری انگلیاں رکھی نظر آتی ہیں۔ لال خان کو کھیل میں دھیان دیے یا تو دستک سنائی ہی نہیں دیتی یا وہ دانستہ ان سنی کر دیتا ہے۔ دوسری بار ہولے سے دستک ہوتی ہے اور لال خان کی بیوی چاند بیگم کی آواز بھی آتی ہے۔
تسلیمات، سنیئے۔

لال خان اپنا بادشاہ ایک طرف سرکا کے خود بھی تھوڑا سا سرک ایک طرف تکیے پہ ڈھہ جاتا ہے مگر نگاہیں بساط پہ جمائے رکھتا ہے۔ صفدر میر بساط سے لال خان کا وزیر اٹھاتے ہوئے اپنا فیل رکھ کے اسے ٹھوکا دیتا ہے اور مسکرا کے سرگوشی کے انداز میں چہرہ اس کے کان کے قریب لا کے کہتا ہے۔

جائیے اب ادھر سے بھی شہ بچ کے آئیے۔ ادھر تو پٹ لیے۔

لال خان شطرنج میں اپنی متوقع پچھاڑ کے باعث اس قدر تلملائے ہوئے بیٹھے تھے کہ شطرنج کی چالیں سوچتے سوچتے کاہلی میں بولے۔

آپ سے کیا پردہ، چلی آئیے۔

ہمارے پرانے مربی دوست صفدر میر آئے ہوئے ہیں۔ علی گڑھ کی گلی دھیرج رو چیلے سے۔ ہمارے دادا کے زمانے سے قرابت داری ہے ان کے گھر سے۔ وہ ابھی بول ہی رہا تھا کہ سر پہ پلو سنوارتی ہوئی، چہرے کے داہنے طرف دونوں ہاتھ سے آسمانی رنگ کی باریک شفون کی زری بوٹی کی زمین پہ زربفت کی گوٹ لگی ساڑھی کا پلو تھوڑی تک کھینچ کے پاؤں میں چاندی کی پازیبیں بجاتی، چاند بیگم چھم سے اندر آ گئی اور پلو کے پیچھے سے داہنے ہاتھ کی انگلی پہ ساڑھی کے پلو کی گوٹ گھماتے ہوئے، اسی ہاتھ کی کہنی بنا کے داہنی ابرو کو چھو کے بولی، آداب بجالاتی ہوں بھائی صاحب۔

صفدر میر ایکا ایکی میں، بساط سے اٹھائے سفید وزیر کو ہاتھ میں لیے، قریب تپائی پہ پڑی اپنی پھندنے والی رومی ٹوپی کو اپنے گنجے سر رکھتے ہوئے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے اٹھا اور لال خان کا وزیر ہاتھ میں پکڑے پکڑے ادب سے اپنا ماتھا چھوتے ہوئے۔ آداب، تسلیمات کہہ کے گاؤ تکیے سے ہٹ کے تھوڑا اسٹ کے سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔

تشریف رکھیے۔

لال خان نے اپنی کہنی کے پاس پڑا تکیہ چاند بیگم کی طرف سرکا دیا۔ اس کا دھیان ابھی تک بساط سے پٹے ہوئے وزیر کی طرف تھا۔

کیسے تشریف لائی آپ؟

وہ اپنے نچلے ہونٹ پہ داہنا انگوٹھا رکھے، نیچے کے اگلے دونوں دانتوں سے انگوٹھے کے ناخن کا سرا کھرچ جا رہا تھا۔ جیسے اسے ہموار کرنا مقصود ہو۔ گاؤ تکیے کو اپنی طرف کھینچ کے چھنا چھن اپنی پازیبوں میں بندھے پاؤں موزوں کر کے، ساڑھی کے

گھیر پہ لگی زری بوٹی میں گھرے پھولوں کی پتیاں سنوار کے اپنی پنڈلیوں کو سمیٹ کے بیٹھتی ہوئی چاند بیگم بولی،

ہم تو دھیرج روبیلے بازار کا نام سن کے سناٹے میں آ گئے۔

اس کے قرب میں ہی تو ہمارا کچھ بچپن گزرا ہے۔ اسی علاقے میں بڑی ہوئیں، سولہ سال پہلے ادھر ہی آپ کے دوست اپنے ابا کے ساتھ برات لے کر آئے۔ بعد میں بھی کچھ عرصہ ہمارے ابا ادھر رہے۔ پھر اس شہر سے چلے گئے۔ اب تو ابا امی دونوں جنت نشاں ہو گئے۔ بھائی ہمارا کوئی تھا نہیں۔ ابا کی بھی مدرسے میں نوکری تھی۔ کونسا آبائی شہر تھا۔ سب چھٹ گیا۔ ایک بڑی آپا ادھر رہ گئیں۔ دھیرج روبیلے بازار کا نام سنا تو جیسے گزرے وقتوں سے کوئی بلاوا آ گیا۔ برسوں سے بند یادوں کی کسی کھڑکی کا دریچہ کھل گیا۔ ادھر پاس ہی تو ہماری آپا زہرہ جبیں کا دولت خانہ ہے۔ ان کے میاں جمال اختر ہیں۔ اسی بازار کے پچھواڑے میں چوک گوہر خان افغانی کی نکر پہ کرم داس تنور کے برابر والے احاطے کی بغلی گلی میں کبوتروں کی چھتری لگے سفید چوبارے والی حویلی، آپا کا گھر ہے۔ خیر سے ان کے میاں کی اپنی نسبی حویلی ہے وہ۔ پانچ بھائیوں میں مجھلے ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے بھائی صاحب انہیں؟

بھابھی! آپ نے تو حد کر دی۔

ہمارے محلے کی ہو کے برسوں انجان بنی رہیں۔ یہ ہمارے دوست ملاحظہ کیجیے، دادا حضور کے دنوں سے مراسم چلے آ رہے ہیں۔ آج تک انہوں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ ہمارے شہر میں، ہمارے ہی محلے میں واردات کر کے انہوں نے اپنا گھر بسایا ہے۔

قربان جائیے اس دیرینہ دوستی پہ۔

صفدر میر ایک دم اپنے سر پہ رومی ٹوپی کو دبا کے، اس کا پھندنا درست کر کے جوش میں آ کر اٹھ کے بیٹھ گیا اور انتہائی شکایت بھرے چہرے پہ مصنوعی غصہ پھیلا کر لال خان کو تکنے لگا۔

بتاتے کب میاں، غدر سے اب تک تین نسلوں کی مسافت میں، کوئی تین ایک بار تو ملاقات ہوئی ہے آپ سے۔ پہلی بار جب آپ ملے تھے تو ہماری شادی کو آٹھ نو سال ہو چکے تھے۔ بیگم کے اماں ابا بھی وہ شہر چھوڑ چکے تھے۔ پھر کیا چرچا کرتے۔ سچی بات ہے ہمیں تو آج ہی آپ نے بتایا ہے کہ ان دنوں آپ دھیرج روہیلے خان گلی میں قیام رکھتے ہیں۔ اسی لیے بیگم سے ذکر بھی کر دیا۔ لال خان اپنی بات ختم کر کے حقے کے کش لینے لگا۔

میاں کوئی سال بھر سے ہم نے دھیرج روہیلے بازار میں گھر لیا ہے۔ پہلے تو شہر کی دوسری طرف لودھی گلی میں رہائش تھی۔ چلیں شہر تو وہی ہے اور اب تو آپ کی آپا ہماری پڑوس کی نکل آئیں۔ دل باغ باغ ہو گیا۔ فرمائیے آپ کے دولہا بھائی کیا شغل فرماتے ہیں۔ سنوں گا تو یاد آ جائیں گے، یہ الگ بات ہے ابھی اس محلے میں زیادہ شناسائی نہیں ہے۔ نئے ہی ہیں اُدھر ہم تو۔ پھر اب وہ عمر بھی نہیں رہی تاک جھانک رکھنے کی۔ کوئی سرکاری اہلکار ہیں کیا وہ؟

سرکاری ہرکاروں میں کیا رکھا ہے بھائی صاحب۔ بیگم چاند بولی۔

سرکاری کیوں، آپ شاہی اہلکار کہیے۔ لال خان فرش سے اپنے پٹے ہوئے وزیر کو اٹھا کے انگلیوں میں ملتے ہوئے چہرے پہ شرارت بھری مسکراہٹ لا کے ترچھی نگاہ سے ہنس کے اپنی بیگم کو دیکھتے ہوئے بولے۔ وہ یوں کہ حضرت کبوتروں کو دانہ کھلاتے ہیں۔ صحن میں لگن پانی کا بھر کے، آسمان پہ اڑتے اپنے گرہ باز کبوتروں کی ٹکری دیکھا کرتے ہیں۔ چھت پہ چڑھے ہوتے ہیں موصوف یا کبوتروں سے بھری چھت ان پہ سوار ہوتی ہے۔ کبوتروں کے بلاوے کے لیے سیٹیاں مارتے ہیں تو منظر دیدنی ہوتا ہے۔ پھر تو محلّہ انہیں دیکھا کیے ہے۔ آپ نے بھی دیکھا ہو گا ہمارے ہم زلف کو، محلے میں سب سے اونچی کبوتر چھتری ہے حضور کی۔

وہ تو حضور اودھ کے نوابوں کا شغل ہے۔ صفدر میر ہنس کے چاند بیگم کی طرف

سے وکالت کرنے لگا۔ نواب واجد علی شاہ چوبیس ہزار کبوتر چھوڑ کے مرے تھے۔ پچیس پچیس ہزار کا ایک ایک نایاب کبوتر ان کے پاس تھا۔ آپ کے دادا حضور کی نقاش حویلی کے سینکڑوں گولے کبوتروں کے اب تک دہلی میں چرچے ہیں۔

اب کہیے۔

کہنا کیا ہے، ابھی چلیں گے حضور اپنی باری!

لیجیے، حضرت ابھی تک شطرنج میں محو ہیں، حضور اب پٹ لیے۔

ہٹائیے یہ چار پیادے فیل اپنے۔ یہ کہہ کے صفدر میر نے شطرنج کی بساط سے مہرے ہاتھ سے اکٹھے کر دیے۔

لو، ابھی تو گھمسان کا رن پڑا تھا۔ آپ نے مہرے ہٹا دیے۔

دیکھئے قبلہ، اپنی تاریخ اٹھا کے دیکھ لیجیے، جب بھی کسی جنگ میں ہاتھی سے سالار اترا، میدان میں نظر نہ آیا تو پیادوں میں بھگدڑ مچی۔ اورنگ زیب شہزادے کے روبرو دارا شکوہ کی تین گنا بڑی شاہی فوج کیوں بھاگی؟ ادھر دارا شکوہ ہاتھی کے ہودے سے اترا۔ لوگوں کی نظر سے دور ہوا، سارے سپاہی، کیا سوار کیا پیادے، سب میں بھگدڑ مچ گئی۔ میاں ادھر تو اپنے پلے سے خریدا ہوا گھوڑا ہوتا تھا، اپنے خرچے سے لی ہوئی تلوار، گھر کی سلی ہوئی وردی۔ رنگ برنگی فوج، ان گھڑت، بے تجربہ جس کی نہ کوئی تربیت گاہ نہ کوئی چھاؤنی۔ کہنے کو آپ کی ساری دہلی ہی چھاؤنی تھی۔ شکار پہ بادشاہ نکلے ہیں تو ساتھ پینتیس ہزار سوار، سوا دو لاکھ پیادے۔ جنگ پہ نکلے ہیں تو اس سے آدھی فوج، اس کا بھی پتہ نہیں کس کمان سے کمان دار، خلیل خان بن کے فاختہ اڑائے جائے اور پانسہ پلٹ جائے۔

میاں لال خان ادھر سپہ سالار سے ساری کھیڈ چلتی ہے۔

وہ سامنے ہے تو ظلِ سبحانی، دور گیا تو وہی مردود۔

تنخواہ کا ملنا نہ ملنا سپہ سالار کے ہونے سے مشروط تھا۔ وہ کوئی انگریزی فوج کا سا

نظام تھوڑی تھا کہ پکی تنخواہ بندھی ہے، جنگ ہو نہ ہو، تنخواہ پوری، سرکاری وردی، پوری عسکری تربیت۔ کیا کرنا ہے کس نے کرنا ہے سب پہلے طے کیا جاتا ہے ہر مہم پہ۔ پورا نظام ہے انگریز کی سپاہ میں۔ ہم یونہی نہیں کہہ رہے، ہمارا صاحب زادہ انگریز کی سپاہ میں ہے۔ ڈیرہ دون سے ترچھی پگڑی لیے، بوشرٹ اور نیکر کے نیچے گھٹنوں تک جرابیں پہن کے تصویر کھنچوا کے بھیجی ہے صاحب زادے نے۔ ہم سے تو پہچانے نہ گئے۔ گلی کے لوگ تصویر دیکھنے ہفتوں گھر آتے رہے۔

خطوں میں برخوردار نے انگریز کی تربیت کے احوال لکھے ہیں۔

تب پتہ چلا ہے شطرنج کھیلی کیسے جاتی ہے۔ ایسے تو نہیں حضور کے شاہ اور سپہ سالار کو ایک سیدھ میں رکھ کے بندوقچی چلا دی۔ آپ کی سپاہ میں بھگدڑ مچا دی۔

اب بولیے۔ آداب عرض ہے۔

انھوں نے کیا بولنا ہے یہ بولیں نہ بولیں، ہار نہ مانیں گے کبھی۔ اصلی دہلی والے ہیں۔ ڈھنے کو چاہے کئی بار دہلی ڈھہ جائے یہ نہ مانیں گے۔ کہیں گے ابھی تو شاہ کھڑے ہیں اپنے قدموں میں۔ وہ چاہے رنگون پہنچ کے لکھ بھیجیں۔

؎ دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

یہ پھر بھی فرماتے رہیں گے۔ چلیے آئیے۔ ساری دلی اپنی ہے۔ اب تو زمانہ بدل گیا۔ آپ کہیے کتنی عمر ہو گی صاحب زادے کی بھائی صاحب، چاند بیگم پوچھنے لگی۔

بھابھی یہی کوئی سترہ اٹھارہ سال کے ہیں۔ قد کاٹھ ماشاء اللہ دروازے سے اونچا ہے۔ ہماری جوتی ان کے پاؤں میں نہیں آتی۔ تین انگل بڑا پاؤں ہے ان کا ہم سے۔ پھر سینہ بھی خیر سے یوں شیر جیسا چوڑا ہے۔ بس اب تو یہی سوچتے ہیں کہ وہ تربیت مکمل کر کے آئیں تو ان کے سہرہ لگا دیکھیں۔ سنا تو ہو گا آپ نے بھی کہ یورپ میں جنگ ہو رہی ہے۔ سب سپاہی ادھر سے تربیت پوری کرتے ہی اُدھر ہی بھیجے

جاتے ہیں۔ ہمیں تو یہ ڈر بھی ہے کہ خیر سے صاحب زادے خوبرو اور خوش شکل ہیں کہیں ادھر کوئی میم فریفتہ ہو گئی تو ہم لوگ تو گئے کام سے۔

بھائی صاحب! ادھر ہی اپنے دیس کی کوئی پری آپ کو صاحب زادے کے لیے مل گئی تو ولایت کی میم کا خوف گیا۔

آپ سچ کہتی ہیں بھابھی۔ دل کی بات کرتی ہیں۔ آپ کی سخن وری سے چغلی ہو رہی ہے۔ نہ بھی بتاتی تو احساس ہونا تھا کہ آپ دہلی کی نہیں ہیں۔

شکر ہے بھائی، سولہ برس اس شہر میں رہ کے بھی لکھنو کے ادب آداب نہیں چھوٹے۔ کہنے کو کچھ برس آپ کے شہر علی گڑھ بھی رہے مگر ہماری اماں تو آخر تھی لکھنو ہی کی نا۔ محلہ حضرت گنج میں اپنے نانا کا دولت کدہ اب تک یاد ہے۔ ان کے پڑوس میں اک نواب کی حویلی تھی۔ جس پہ آٹھوں پہر نوبت بجتی تھی۔ ہر پہر میں آٹھواں گھڑیال۔ بچپن میں کئی بار تو ہم خود سہیلیوں کے ساتھ ادھر گئیں نوبت بجتی دیکھنے۔ کیا منظر ہوتا تھا۔ پتیلے میں چھید ہوا پیتل کا کٹورا پڑا ہوتا۔ ایک گھڑی میں بھر جاتا تو پہرے دار کٹورا اٹھا کے خالی کر کے رکھتا اور نوبت بجا دیتا۔ ہائے کیا آواز ہوتی تھی اس کی۔ اب وہ زمانے کہاں بھائی صاحب۔ وہ آواز تو گم گئی۔ وہیں کہیں رہ گئی ہمارے بچپن کے گم ہوئے سالوں میں۔

چاند بیگم یہ کہہ کے طشتری اٹھا کے صفدر میر کو چھالیا پیش کرتی ہے۔

صفدر میر ایک چٹکی چھالیا کی اٹھاتا ہے، اور ماتھے پہ ہاتھ رکھ کے آداب کہتے ہوئے چہرے پہ بے حد خوشی کے تاثر لا کے دونوں ہاتھوں کو عجیب نرت بھرے رقص کرنے کے انداز میں ہلا کے کہتا ہے،

بھابھی حضور آج تو کسی خوش بخت کا چہرہ دیکھ کے سورج چڑھا ہے۔

لکھنو کی تو ہماری اماں بھی تھیں۔ چار باغ کے شمال میں امین آباد میں گھر تھا ان کا۔ حضرت گنج اور ہمارے محلے بیچ فقط ایک قیصر باغ تھا۔ وہیں دونوں محلوں کے لوگ

آئے بیٹھے ہوتے تھے۔ نو سال ہو گئے انہیں خلد آشیاں ہوئے مگر آنگن میں ان کی کہی ہوئی باتیں ابھی تک بیلے کی کلیوں کی طرح مہکی پھرتی ہیں۔ حد ہو گئی۔ ہمارے دوست سے اب کون گلہ کرے کہ سولہ سال سے گھر میں خوشبو کی بیل چڑھائے بیٹھے ہیں اور کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ دیکھیے ان کے دادا حضرت شائستہ خان اور میرے دادا حکیم میر عبدالواحد میں گاڑھی چھنتی تھی۔ دونوں کے لیے لال قلعہ سے شاہی پالکیاں آتی تھیں بلاوے پہ۔

مہینے میں ایک دو بار شہنشاہ کے حضور حاضری ہوتی تھی دونوں کی۔ کہتے ہیں دنوں تک شطرنج کی بازیاں چلتی تھی ان دنوں۔ حضور یہ انہی سے چلتا آیا استادی گر ہے کہ شاہ اور وزیر کو ایک ترچھی نگاہ جیسی لکیر میں گھیر کے لائیے اور پٹ دیجیے، جیسے فرنگیوں نے کیا تھا۔ شطرنج تو شاہی بساط ہے۔ انگریز نے ادھر سے بھی گر سیکھے اور بہتیرے سکھائے۔ یہ کھیل ہی ایسا ہے، شروع ہو جائے تو ایک نہ ایک شاہ کے گرنے تک جاری رہتا ہے۔

کئی کئی دن بازیاں جمی رہتی تھیں۔

کیوڑے اور شربت کے گلاس چلتے تھے۔ اسی دھوم دھام سے حضور شعر و سخن کی محفلیں بھی بپا ہوتی تھیں۔ ریشمی غلافوں سے ڈھکے گاؤ تکیوں پہ نیم دراز گھنٹوں دونوں دوست بیٹھے داد دیا کرتے تھے۔ مرزا نوشہ غالب تو لال خان کے دادا حضور کی پہلی حویلی کے توشہ خانے میں کئی بار تشریف لائے۔ کئی بار ان کے روبرو اصیل مرغوں کو پال میں اتارا گیا۔ پانچ پانچ دن تک مرغ لڑا کرتے تھے۔ چاقو سے مرغ کی چونچیں تیز کی جاتی تھیں۔ جدھر چونچ پڑتی بوٹی نکال دیتے۔ پانی کی پھواریں مار مار کے زخموں کو سہلایا جاتا تھا۔ مرغ کے زخم تو منہ میں لے کر ایسے چوسے جاتے تھے کہ زخم سنور جاتا۔ مرغ پھر سے پاؤں پہ اکڑ جاتا۔ اصیل مرغ تو بھابھی، مر جاتے ہیں، لیکن پال سے نہیں نکلتے۔ ہم نے تو ساری باتیں اپنے دادا سے سن رکھی ہیں۔ عجیب دن

تھے، کہتے ہیں وہ بھی۔ گھر گھر میں سہولت اور خوشحالی کے انبار لگے تھے۔ ہر کوئی مزے میں مست۔ زندگی ان دنوں ڈھول تاشوں، روشن چوکی، نوبت، بگل اور ڈنکے پہ بجتی تھی۔ کنچیاں، چونے والیاں اور نرت رنگی وہیں منڈلیاں بنائے، ڈیرے اٹھائے امیروں کے گھروں میں آتی جاتی تھیں۔ پہلی حویلی میں ہمارے دادا کہتے تھے، ایک پوری اوپر کی منزل ان کے دادا حضور نے ان کی دادی سے چوری ڈیرے والیوں کے لیے رکھ چھوڑی تھی۔ چوری رکھنے کا تو اک بھرم تھا ورنہ انہی کے گھر کی مہریاں، آبدار خانے ساتھ لیے ڈیرہ ڈالنے والیوں کے لیے متنجن، بریانی، کباب، ترکاریاں اور شیرمال لے کر جاتی تھیں۔ آپ ان کے دادا کی بات کرتی ہیں، ہمارے دادا ان کی حویلی پہ جا جا کے انہی چونے والیوں کے ہاتھ سے لگے چونے والے پان منہ میں رکھے چھت پہ چڑھ کے کنکوے اڑاتے تھے۔ اپنے ہاتھ سے بیٹھ کے تکلوں کی کانپیں درست کرتے۔ تکل اڑتی تو ساتھ بیس بیس روپے کی جھل جھل اڑائی جاتی۔ جو کٹی پتنگ لوٹتا نہال ہو جاتا۔

کہتے ہیں مرزا غالب خود اُدھر آ کے پیچ لڑتے دیکھا کرتے تھے۔ یہ خدا جانے خود بھی انہوں نے شوق فرمایا یا نہیں۔ بہر حال ہمارے دادا حکیم عبدالواحد سے مرزا صاحب کی یاد اللہ تھی۔ دادا کہا کرتے تھے کہ مرزا صاحب کی صحت بھی ان کے کلام کی طرح نازک تھی۔ کئی بار ہمارے دادا سے مرزا صاحب نے مفرح بوعلی سینا اور خمیرہ مروارید طلب کیا۔ ماء اللحم، ورق طلا عنبر اشہب، عرق کیوڑہ قند، کثرت اجزاء اور گاہ گاہ سکنجبیں اور گلاب کے گلاس ہمارے دولت کدے پہ آ آ کر پیے۔ تبھی تو وہ موزوں کلام کہا۔ کیا کہتے ہیں میاں لال خاں۔

لال خان نے لحہ بھر خاموشی سے آنکھ اٹھا کے صفدر میر کو بغور دیکھا اور پھر زیر لب مسکراہٹ چھپا کے بولے۔ جی ہاں حضور مرزا نوشہ کی شاعری میں، سارا کمال آپ کے قبلہ دادا خلد آشیاں کے مجوزہ معجون و خمیرا جات کا تھا۔ آپ کے لیے نہیں چھوڑا

انہوں نے کوئی بھرا ہوا مرتبان۔
آپ بھی حد فرماتے ہیں۔ اجی غدر میں بچا ہی کیا تھا۔ جو تیسری نسل تک پہنچ جاتا۔ صفدر میر، لال خان کی پھبتی کو سنجیدہ سوال سمجھ کے دلیلیں دینے لگے۔
ایسی پکڑ دکڑ شروع ہوئی کہ بچا کون۔ مکان لٹ گئے، حویلیاں گر گئیں، پورا محلہ گرا کے میدان بنا دیا فرنگیوں نے۔ قلعے کے آس پاس، لال ڈگی تک میدان نکل آیا۔ سجی سجائی دکانیں، ہنستے بستے گھر، فیل خانے، بلاقی بیگم کے کوچے سے خاص بازار تک کیا بچا رہ گیا۔ دیکھ لیجیے میدان ہے۔ دیکھ کے لگتا ہے بھلا ایک پل کو بھی کہ یہاں صدیوں تک بستیاں بستی رہی ہوں گی۔ صاحب عجائبات زمانہ ہیں۔ (صفدر میر کی سنجیدہ تقریر سنتے ہوئے لال خان بظاہر متین چہرہ بنائے اپنی بیگم کی طرف چوری آنکھ سے دیکھ کے شرارت سے مسکرا کے ایک آنکھ کا ابرو اٹھا کے، اشارہ کرتے ہیں کہ لو سنو تقریر، صفدر میر نے تاڑ لیا اور بولتے بولتے ایک لمحے کو چپ ہو کے نگہ گھما کے دونوں کی طرف دیکھا پھر ذرا لہجہ بدل کے بولنے لگے جیسے کچھ دیکھا ہی نہ ہو) وہ تو زمانہ اور تھا، گھر گھر تلاشی تھی۔ پکڑ دکڑ تھی۔ آزردگی کا زمانہ تھا۔ بچا کیا رہتا۔ آپ ہمیں دادا حضور کے مرتبان کی پھبتی فرماتے ہیں۔ کون بچاتا۔ جدھر کسی کے سینگ سمائے وہ بھاگ لیا۔ شاہی محلات کی وہ بیگمات جن کے گالوں سے دھوپ کی کرن نہ کبھی چھوئی تھی، چھپ چھپ کے ماری ماری پھرتی تھیں۔ کپڑے میلے، پائنچے برابر، جوتیاں ٹوٹی، گھر گھر جا کے ایسے تیسوں کے جھوٹے برتن دھوتیں اور دو وقت کی گزارن کرتیں۔ ہمارے دادا کا کنبہ مارا گیا (لال خان ایک دم سے سنجیدہ ہو کے سر نہوڑ کے ادب سے بیٹھ گیا۔ چاند بیگم بھی گھٹنے جوڑ کے ساڑھی کا پلو درست کر کے حزن بھرا چہرہ بنا کے بیٹھ گئی جیسے شاہی محلات کی جن بیگمات کا ذکر ہوا ہو وہ اس کی خالائیں ہوں) کوئی پھانسی چڑھا، کسی کو قطار میں کھڑا کر کے توپ سے مار دیا گیا۔ کوئی فرنگی سنگین سے کٹ کے گر گیا۔ دادا حضور ہمارے، گھر سے دو مرتبان خمیرہ گاؤزبان عنبری تھیلے میں

ڈال کے، تھیلا بغل میں لٹکائے (لال خان کے چہرے پہ پھر شرارت بھری مسکان کی لہر آئی) میری دادی کو کندھے سے پکڑ کے نکل بھاگے، اپنے کم سن بیٹے کو ساتھ لے کر، جو ہمارے ابا تھے، یہ لال خان میاں نے تو دیکھا ہے ابا کو۔ تخی سے آدمی تھے۔ بچپن کا ایسا خوف ان پہ چڑھا تھا کہ ساری عمر یونہی سہمے سہمے گردن کندھوں میں دبا کے، چوری آنکھ سے دائیں بائیں دیکھتے گزار دی۔ جیسے فرنگی پیچھے لگے ہوں۔ ہمارے دادا حضور گھر سے جو نکلے تو انہیں انگلی سے لگا کے کہیں رات کی تاریکی میں نکل لیے۔ دو مہینے کے لگ بھگ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے محلے میں ایک اجڑے ہوئے بھینسوں کے طویلے میں چھپے رہے۔ تیسرے مہینے کے شروع میں کسی بیل گاڑی میں بیٹھ کے چھپتے چھپاتے علی گڑھ پہنچے۔ تب سے وہیں رہ گئے۔ وہ تو ابا حضور نے قبلہ دادا سے حکمت کے رموز ہی نہ سیکھے۔ یا شاید دادا حضور نے دیگر حکماء کی دیکھا دیکھی، حکمت بھرے راز افشاء کرنا نہ گوارہ کیے۔ پھر ابا کم سن ہی تھے کہ دادا جنت نشان ہو گئے۔ مرتبان ایک رہ گیا۔ جواں ہونے تک گھر میں ہی چاٹ چاٹ کے ختم ہو گیا۔ ہم تک کدھر سے پہنچتا۔

لال خان اس بات پہ کھلکھلا کے ہنس پڑا اور اپنے ہنسی کے جواز میں کچھ بولنے کے لیے سوچتا ہوا بولا۔ آپ یوں حکیم نہ بن سکے اپنے دادا مرحوم کے رتبے کے۔

ہم کدھر سے بنتے حکیم، صاحب۔

ایک خمیرہ گاؤزبان عنبری کے مرتبان سے حکمت تھوڑی آتی ہے۔

پھر دال روٹی کے لالے پڑے تھے۔ ہمارے ابا کو دادی نے ایک درزی کی دکان پہ بٹھا دیا۔ ذہن تیز تھا۔ وہ تو ہونا ہی تھا خمیرہ گاؤزبان عنبری کھایا ہوا تھا۔ مہینوں کا سبق ہفتوں میں ازبر ہو گیا۔ چند ہی برس میں ایسے مشاق ماہر خیاط ہو گئے۔ سنا ہے: پرانے وقتوں کے گھنڈیوں والے "شلوکے" سینہ ڈھاکنے کے نیمہ "اور گول گریباں کھلے نیچے سے گھیر والے "بالابر" بھی مہارت سے سیتے تھے۔ وہ جو جامہ اور بالابر کے ملاپ سے "انگرکھا" ہوتا تھا۔ وہ ان کے الٹے ہاتھ کا کام تھا۔ چیزیں تو وہی تھیں۔ چولی

قبا سے لے لی۔ سینہ کھلا بالا بر کی طرح رکھ کے کونے کوتراس کر دیے، نیچے ہلال نما کنٹھا لگا دیا۔ اجی اسی انگر کھے کی ترمیم سے چپکن بنی۔ چپکن میں انگر کھے کا رنگ زیادہ ہوا تو اچکن بن گئی۔ یہ اچکن دکن میں پہنچی تو فرنگی اثر سے اسے انگریزی کوٹ کی آستیں اور سینہ لگ گیا تو شیروانی کہلانے لگی۔ ہمارے علی گڑھ میں پہنچی تو اس میں لال رومی ٹوپی کے پھندنے کے نیچے پھن کے نچلے گریبان کے سفید کالر اور کلائی سے آستین کی جھلک سے الگ ہی شان پیدا ہو گئی۔ اب یہی رائج ہے زیادہ تر۔ وہ تو کیا ہوا، شیروانی کی سلائی میں بڑی عرق ریزی کرنا پڑتی تھی۔ ابا بوڑھے ہوئے تو نگہ کم ہو گئی۔ سوئی میں دھاگہ نہ ڈلتا تھا۔ قینچی خوب چلتی تھی۔ وہ تو بھلا ہوا پنے سرسید جی کا، علی گڑھ میں مدرسہ بنا لیا تو کتابوں کا پیوں کی مانگ ہو گئی۔ ابا نے بڑھاپے میں نگہ کی کمزوری کے باعث درزی کا کام چھوڑ کے جلد سازی شروع کر دی۔ کہتے تھے بیٹا کتابیں اگر پڑھنے کا موقع نہیں ملا تو انہیں سجانے بنانے ہی کا کام کر لو۔ اندر سے سنور جاؤ گے۔

لیجیے ہمیں اسی کام میں ڈال دیا۔ خود چلے گئے۔ آج انہیں فوت ہوئے بارہ سال ہو گئے۔ ایک آدھ بار ہی شاید وہ آپ کے ابا کو ملے تھے۔ مگر یادیں انہیں بچپن کی یاد تھیں۔ بس دہلی سے اجڑ کے گئے تو دہلی آئے ہی نہیں۔ ساری عمر دہلی سے ڈرتے رہے۔ ان کے ذہن میں دہلی کا ڈھنا، جلنا اور لوٹے جانا نقش ہو کے رہ گیا تھا۔ کبھی آنا پڑتا تو سہم جاتے۔

بچپن کی تلخ یادیں بھی کیا غضب کا زہر رکھتی ہیں۔

ساری عمر ناگ بن کے ڈستی رہتی ہیں۔ پھن پھیلائے نس نس میں سرسراتی رہتی ہیں۔ ہم نے انہیں ان سانپوں سے ڈرتے دیکھا تو سمجھ آئی لوگ گزرے سانپ کی لکیر کو کیوں پیٹتے ہیں۔ اور تو اور ہمارا رخ بھی دہلی کی طرف نہیں ہونے دیا۔ خود بھی وہیں سمھند باندھ لیے۔ ہماری اماں سے وہیں علی گڑھ میں رشتہ ہوا ابا کا۔ اماں ہماری، ابا کے استاد خیاط موسیٰ کی بھتیجی تھیں۔ استاد خیاط موسیٰ کے ہاتھ میں قینچی کسبیوں

کی زبان کی طرح چلتی تھی مگر زبان میں ان کے لکنت تھی۔ ٹھہر ٹھہر کے بچوں کی طرح تتلا کے بولتے تھے۔ پر اماں ہماری کے منہ میں اپنے چچا کی زبان نہیں بلکہ ہاتھ کی قینچی تھی۔ ایسی تیز باتیں کرتی تھیں اماں کہ کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔

بندہ ایک بات کا جواب سوچتا تو ان کی بات کہیں اور آگے پہنچی ہوتی۔

کبھی کبھار جب اماں اپنے چچا کے ساتھ یعنی خیاط موسیٰ کے پاس بیٹھ کے باتیں کر رہی ہوتیں تو عجیب نظارہ ہوتا۔ ایسے لگتا جیسے کسی سرپٹ تیز بھاگتے گھڑسوار کے ساتھ کوئی لنگڑا پیدل چل رہا ہو۔ زبان کی طراری کے ساتھ ساتھ اماں کی زبان کی مٹھاس بھی سوا تھی۔ لکھنو کی تھیں آخر۔ یوں ہم لٹے پٹے خانوادے کے نصیب سے سارے ستارے تو نکل گئے زبان کی گھلاوٹ آ گئی۔ ادب آداب جاننے کی سبیل ہو گئی۔ انہیں بھی دنیا سے رخصت ہوئے پندرہ سال ہو گئے۔ مگر ہمارے گھر کے درودیوار آج بھی ان کی کہی باتوں کی مٹھاس اور رس میں گلاب جامن کی طرح لتھڑے کھڑے ہیں۔

ویسی گفتگو کی دلکشی اب کہاں۔

وہ تو آپ کے منہ سے پھول جھڑتے دیکھے بھابی حضور، تو دل میں اک کلی سی پھوٹی ہے۔ خیر سے آپ کی اولاد میں بڑی ارجمند بیٹی ہیں۔ صبح ناشتہ لے کر آئیں تو انہیں دیکھ کے آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔ ہمارے بڑے صاحب زادے دلارے میاں ہیں، جن کی بابت عرض کر رہا تھا فرنگی فوج میں سپاہی ہیں۔ اب اپنے منہ میاں مٹھو والی بات لگتی ہے اگر تفصیل کہوں۔ ہاں اللہ کے فضل سے بانکے سجیلے ہیں۔ قد کاٹھ میں ہم سے اتنے اونچے ہیں کہ ہمارے ساتھ کھڑے ہوں تو ہمارے فرزند نہیں لگتے۔ اوپر سے رنگ روپ فرنگیوں جیسا ہے۔ وہ تو بھلا ہو فرزند نے نین نقشہ ہمارا چرایا ہے۔ ہو بہو ہماری کاپی ہیں، بس یہ چندیا نہیں ہے سر پہ۔ (وہ سر سے رومی ٹوپی اٹھا کے دوبارہ سر پہ رکھ لیتا ہے) بڑے گھنے گھنگریالے بال ہیں۔ فوج میں جا کے وہ بھی کہنے کو

ویسے نہیں رہے۔ تصویر میں ہی ہم نے تو دیکھا ہے جو انہوں نے ادھر سے بھیجی تھی۔ کانوں کے اوپر مشین سے انگریزی حجامت بنی ہوئی ہے۔ کیا بتاؤں کیا سوہنا چہرہ لگتا ہے انگریزی حجامت میں ان کا۔ اٹھارواں سن چڑھا ہے ان کا ابھی۔ ہم ہوئے خفقانی دل کے مریض، بیٹھے بٹھائے کبھی کبھار یونہی سر چکرا جاتا ہے۔ ایک دو بار تو کھڑے کھڑے ہم گر بھی گئے۔ شکر ہے چوٹ زیادہ نہیں آئی۔ دادا مرحوم زندہ ہوتے تو چٹکی میں دوا تجویز کر دیتے۔ مگر اب ایسے جید حکیم کہاں۔ اناڑی لوگ ہیں۔ نیم حکیم خطرہ جاں۔ ایک دو کے پاس گئے۔ کچھ نے کہا دل کی رگیں کم کم خون اگلتی ہیں۔ کچھ کہنے لگے پرانے سرسام سے ہوئی مرگی کی شکل ہے۔ اب آپ دونوں دلی قربت کے لوگ ہیں سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں وہم ہونے لگا کہ کہیں صاحب زادے کے رخ پہ سہرا دیکھنے سے پہلے نہ لدھ جائیں۔

خدا خیر کرے، آپ کیسی باتیں کرتے ہیں بھائی صاحب۔

چاند بیگم ایک دم سے تڑپ کے بولیں۔

بھابھی کیا پتہ۔ بلاوے کے لیے کوئی خط پتر تھوڑی آتا ہے۔ اپنی تو تیاری ہے۔

تین بیٹیاں ہیں۔ دو خیر سے بیاہی گئی ہیں۔ اسی شہر میں اپنے اپنے گھر پھول پھل رہی ہیں۔ تیسری بیٹی زیتون ہے۔ آپ کی ارجمند بانو کی ہم عمر ہوگی۔ ارجمند جیسی ہی خوش رو اور خوش شکل ہے۔ بڑا نفیس ذوق پایا ہے اس نے۔ شعر موزوں کر لیتی ہے۔ بیاض اپنی بنا کے رکھی ہوئی ہے، ہم سے چھپا کے رکھتی ہے۔ نظر بچا کے اٹھ کے کبھی کبھار چوری پڑھ لیتے ہیں ہم بھی۔ تبھی راز کھلا ہے کہ وہ تو بڑے نازک خیال قلم بند کرتی ہیں۔ لال خان بھائی پھبتی فرما رہے تھے نا کہ مرزا غالب کو دیے، ہمارے دادا کے خمیرہ گاؤزبان عنبری کے مرتبان کدھر گئے، تو حضرت کچھ تو اثر پہنچ ہی گیا۔ ہم تک نہ سہی ہماری بیٹی کے ذوق میں تو نکھار آ گیا۔

صفدر میر کی اس بات پہ لال خان اور اس کی بیگم جی کھول کے خوش ہوتے ہیں۔

لال خان صفدر میر کے قریب ہو کے اسے بازوؤں میں لپیٹ کے پیار کرتا ہے۔
دونوں ایک دوسرے کے کندھوں پہ بازو پھیلا کے اک دوسرے کی کمر کو تھپتھپاتے ہیں اور زور زور سے ایک دوسرے کو بھینچ کے معانقہ کرتے ہیں۔ پیار کے اس انداز میں ایک عجیب لطیف سی رقت کی کیفیت سی طاری ہو جاتی ہے۔ صفدر میر کچھ کہنے لگتا ہے تو اس کی آواز جیسے بھرا جاتی ہے۔ وہ اپنا گلہ صاف کر کے دوبارہ بات کرتا ہے۔ کہتا ہے۔ بھابھی ہماری نسل در نسل پرانی دوستی ہے۔ اسے کبھی زوال نہیں آیا۔ آپ سے ملاقات کے بعد تو خواہش ہو رہی ہے کہ یہ تعلق لازوال ہو جائے۔ آپ کی اولاد میں بڑا بیٹا ہوتا تو میں اپنے منہ سے بنتی کر کے اپنی بیٹی کا بَر پیش کرتا۔ اب آپ کی بیٹی ارجمند بانو کے لیے میں آپ سے سوالی ہوں۔ واللہ مجھے رد نہ کیجیے گا۔

لو بھائی صاحب، آپ سے تو آج ہی ملی ہوں۔ مل کے لگتا ہے برسوں کی شناسائی ہے۔ واللہ پابند تو نہ کیجیے۔

بھئی دیکھیے، لال خان میاں سے تو ہمارے نسل در نسل کی تعلق داری ہے۔ ان سے اسی لیے ہم نے نہیں پوچھا۔ آپ سے بھی بر سبیل تذکرہ عرض کی ہے۔ یوں سرسری عرضی پیش کرنا مقصود نہیں ہے۔ اہتمام سے روح کیوڑے میں زعفران ڈال کے ریشم کے موتیے رنگے رومال پہ حال دل لکھ کے پیش ہوں گے اپنے دلارے میاں کی والدہ کے ساتھ۔ اب تو خیر سے ہمارے شہر میں خدا نے چاہا تو ایک نہیں آپ کی دو دو رشتے داریاں ہوں گی۔ آپ کی آپا کے گھر جا کے بھی آداب عرض کریں گے۔ ہاں تو آپ نے بتایا نہیں آپ کی آپا محترمہ کے میاں کبوتروں کی افزائش نسل کے علاوہ کیا شغل فرماتے ہیں؟

بھائی صاحب، کبوتر تو شاہی تفریح طبع کے لیے رکھ چھوڑے ہیں میاں نے۔ وہ تو چوڑی بازار میں منیاری کی دکان کرتے ہیں۔ ہماری آپا برس دو برس بعد جب کبھی دلی آئیں تو ٹرنکی بھر کے گوٹے کناری، آبدار موتی، کانچ کی چوڑیاں رنگین اور کئی رنگ

کے بٹن زنانہ اور مردانہ ساتھ لے آتی ہیں۔ لو سال بھر سے اوپر ہو گیا انہیں ادھر آئے ہوئے، ابھی تک ارجمند بانو کی بانہوں میں انہی کی لائی ہوئی چوڑیاں کھنک رہی ہیں کانچ کیں۔ ہم نے تو کانچ پہننا چھوڑ دیا ہے۔ سونے کی چوڑیاں انہوں نے کبھی لا کے نہیں دیں۔ اپنی شادی کی یہی چار چوڑیاں ہیں۔ وہی پہنے رہتی ہوں۔ اب خیر سے اللہ اچھی کرے، ارجمند بانو کی شادی پہ دونوں بانہوں میں چوڑیاں پہنوں گی سونے کی۔ آپ اپنے دوست کو کہہ دیجئے۔ اس بار ڈنڈی نہ ماریں۔ پتہ نہیں ان کے دادا حضور بھی ان کی طرح خسیس تھے یا نہیں، یہ تو پیسے کو ہوا نہیں لگنے دیتے۔

کیوں بھئی! میاں لال خان، یہ کیا سن رہے ہیں ہم۔ اتنے بڑے کارخندار ہیں آپ۔ ٹھپائی کا کام آپ کا بنگال سے پنجاب تک جاتا ہے۔ خدا جانے کتنا مال بوریاں بھر بھر کے، دیگوں میں ڈال کے زیر زمین رکھا ہو گا۔ بھابھی کے لیے چار چوڑیاں سونے کی نہ بن سکیں ابھی تک۔ یہ کیا بھید ہے۔

ہم تو کہتے ہیں یہ بھابھی کی چاندی کی پازیبیں بھی موقع ملے تو بدل دیجئے۔ کہتے ہیں سونے کی چھم چھم الگ ہی سروں میں بجتی ہے۔ کیوں بھابھی۔

ہم نے تو بھائی صاحب، ایسی سروں کی لے اپنے پیروں سے نہیں سنی۔ یہ سنا دیں تو سن لیں گے۔

بھئی لال خان، بھائی میرے۔ بھابھی کے تقاضے اتنے بڑے تو نہیں جو ایسا دکھی سا چہرہ بنا لیا ہے آپ نے۔

اجی صفدر میر صاحب، کارخنداری بھی محض نظر کا پھیر ہے۔

پہلے دکانداری تھی چار پیسے جیب میں رہتے تھے۔ اچھا کھاتے تھے اچھا پہنتے تھے۔ چار پیسے بچا کے بھی رکھ چھوڑے تھے۔ بس ناسی میں جو جمع پونجی تھی اس کارخانے میں لگا دی۔ یہ تو اندھا کنواں ہے۔ جب دیکھو خالی۔ اوپر سے ملازموں کی تنخواہیں اور ان کے نخرے۔ اب کیا کہوں ہمیں تو کئی جگہوں سے قرض لینا بھی پڑ گیا۔

ان کے تقاضے سوا ہیں۔ جن سے پیسے لینے ہیں وہ وعدہ وعید پہ ٹرخاتے رہتے ہیں۔ شاید یہ بہت زیادہ پیسوں کا کھیل تھا۔ ہم نے ذرا جلدی کی۔ چلیں اللہ مالک ہے۔ نیا نیا کام ہے۔ تجربہ بھی دھیرے دھیرے قدم قدم چل کے آتا ہے۔ شروع شروع کی مشکلات ہیں۔ دور کر دے گا اللہ۔ یہ کاروبار ہی ایسا ہے۔ نقد دے کے مال لو اور ادھار پہ بیچو۔ کوئی سرکاری نوکری تو ہے نہیں کہ ہر پہلی تاریخ کو بندھی بندھائی تنخواہ آ جائے۔

سرکار کی نوکری کی کیا بات ہے، صفدر میر کہنے لگا۔ ہمارے صاحب زادے کو دیکھیے، کہیں جا کے انگریز بہادر کی چھاؤنی دیکھ آئے۔ وہاں کی چکنی سڑکیں، نکھری عمارتیں، کھلے باغ باغیچے اور ان کا اٹھنا بیٹھنا۔ بس دل میں شوق بسا لیا کہ فوج میں بھرتی ہونا ہے۔ ابھی مونچھیں پھوٹنا شروع نہیں ہوئیں تھیں کہ خلیفہ جی سے جا کے استرا پھروا لیا چہرے پہ۔ کالے بال پھوٹنے لگے چہرے پہ تو مونچھیں نہ کتریں۔ کہیں مونچھیں بڑا کر کے ان پہ لیموں رکھوں گا۔ اندازہ کیجیے، گھر میں شور مچا دیا صاحب زادے نے کہ فوج میں بھرتی ہونا ہے۔ رسالے کی پلٹن میں جا کے سر پہ سنہری تلے والی پگڑی باندھنی ہے۔ کمر پہ توش دان لٹکانا ہے۔ ان کی اماں نے بہتیرا سمجھایا، نصیحتیں کیں، رونا دھونا مچایا۔ ہم سے بھی شکوے شکایات کا دفتر کھول لیا۔ کہے ایک ہی ہمارا بیٹا ہے نظروں سے دور ہو گیا تو اندھیر ہو جائے گا۔ ہم کون سے اسے دور بھیجنے کے حق میں تھے۔ مگر سچی بات ہے فرنگی فوج کی شان دیکھ کے ہمارا اپنا جی ساری عمر للچاتا رہا ہے۔ کہ ان کے دستے میں ہوتا تو دنیا کے عجائبات دیکھتا۔ بھانت بھانت کے شہروں اور علاقوں میں جاتا۔ اوپر سے گھوڑے کی سواری۔ ساتھ کمر میں لگی ہوئی تلوار۔ ذرا سوچیں تو سہی شان ہی اور ہے فوج کے سوار کی۔ کبھی پہاڑوں پہ کبھی ریگزاروں میں۔ سمندر پار تک یہ ہو کے آتے ہیں۔

ہمارے اپنے پڑوس میں ایک انگریزی رسالے کی پلٹن کا عہدے دار ہے۔

جب کبھی چھٹی پہ گھر آتا ہے تو گھر کے باہر چبوترے پہ کرسی ڈال کے راجوں کی طرح چوڑا ہو کے بیٹھ جاتا ہے۔ گلے میں سونے کی مالا ہوتی ہے اس کے، انگلیوں میں نگینوں والی انگوٹھیاں، نئے دھلے چمکتے کپڑے، جیب میں سونے چاندی کے سکے۔ کہانیاں سنانے لگے تو تبت، کشمیر، بنگال، دکن، اجمیر اور کابل تک کے قصے سن لیجیے۔ ایسے لگتا ہے انسانوں کی نہیں جنوں اور پریوں کے دیسوں کی کہانیاں کہہ رہا ہو۔ ہمارے بس میں ہوتا تو خود جوانی میں جا کے بھرتی ہو آتے۔ اب بیٹے کا سوچتے ہیں چلو کبھی وہ بھی ایسی منڈلی لگا کے اپنی دیکھی دنیا دوسروں کو دکھایا کرے گا۔ چند ماہ ہوئے یورپ میں جنگ شروع ہو گئی تو ادھر بھی لام پہ لوگ جانے لگے۔ دلارے میاں بھی جا کے بھرتی ہو لیے۔ گھر سلام کرنے آئے۔ ٹرنکی میں دو چار جوڑے کپڑے رکھے اور ماں کو روتے دھوتے چھوڑ کے ہمیں گلے مل کے چل دیے۔ ابھی اگلے مہینے کی سات تاریخ کو وہ رخصت لے کر گھر آ رہے ہیں۔ لکھا ہے کہ تربیت مکمل ہو رہی ہے۔ چھٹی کے بعد کسی پلٹن میں جا کے رہیں گے۔ اب پلٹنیں رسالے کی تو کئی سمندر پار بھی گئی ہیں، جا رہی ہیں۔ یوں ہم نے سوچا، اور اپنی بیگم سے بھی صلاح کی کہ اگر صاحب زادے کو بھی ولایت جانا پڑ گیا جو کہ ظاہر ہے جانا پڑے گا کیونکہ سرکار نے بھرتی ہی اس جنگ کے لیے انہیں کیا ہے جو ادھر نہیں ہے۔ ان کے اپنے دیسوں میں ہے۔ یہ ادھر ضرور جائیں گے۔ تو پھر اور مسئلہ پڑ جائے گا۔ ادھر سے صاحب زادہ کوئی میم نہ لے آئے آتے ہوئے۔ اسی لیے کچھ مہینوں سے ہم دونوں میاں بیوی بہو کی تلاش میں تھے۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ ہمارے نصیب اتنے بھاگو شالے ہو سکتے ہیں۔ ارجمند بانو جیسی بہو ہمارے گھر آئے یہ ہماری خوش نصیبی سی خوش نصیبی ہے۔ ایسی بہو کے ہونے سے اڑوس پڑوس والے ہماری قسمت پہ رشک کریں گے۔ صاحب زادے کے فرنگی سپاہ میں جانے سے ہی محلے میں دھاک بیٹھ گئی ہے۔ ہمارے گھر کے برابر ایک کھلے احاطے پہ پڑوس والے سناروں نے عدالت میں مقدمہ کر رکھا ہے۔

پانچ سال پہلے نقد تنتالیس روپے دے کر وہ سوا چار مرلے جگہ خریدی تھی۔ صراف پیسے والے ہیں، پڑوسی ہونے کے سبب کچہری میں بات لے گئے۔ جوتیاں گھس گئیں ہماری کچہری مقدمے ہیں۔ احاطے کی مالیت سے بڑھ کے اس پہ خرچہ اٹھ گیا۔ دردسری الگ۔ اوپر سے یہ خوف الگ کہ کہیں احاطہ ہاتھ سے نکل نہ جائے۔

اب تو ہم دلارے میاں کے انتظار میں ہیں۔

جس دن آئے وردی پہنوا کے ساتھ عدالت لے جاؤں گا۔ جج گورے صاحب بہادر ہیں۔ دلارے میاں فرنگی پوشاک میں پاؤں جوڑ کے کھڑاک سے سلوٹ کر کے انگریزی میں دو بول تھینک کیو۔ ویل کم بولیں گے اور ہمارا احاطہ پکا ہو جائے گا۔ صرافوں کے تو ابھی سے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ہیں۔ گلی میں نگہ ملے تو آنکھیں جھکا لیتے ہیں۔ ورنہ ساڑھے چار، پونے پانچ سال انہوں نے دیدے پھاڑ پھاڑ کے ہمیں ایسے گستاخانہ انداز میں دیکھا کیا کہ ہمارے دل میں ان سے مڈبھیڑ ہونے کا خوف پلتا رہتا تھا۔ ان گڑھ سے ہیں۔ بس سونے کی کٹھالیوں کی کناریوں سے چوری کا سونا جمع کرتے کرتے چار پیسے کیا بنا لیے پوری گلی کو اپنی جاگیر سمجھنے لگے۔ اب دلارے میاں کی انگریزی رسالے کی پلٹن میں ملازمت کا سن کے ان پہ پہلی بار ہیبت بیٹھی نظر آتی ہے۔ ڈیرہ دون سے پہاڑوں کی قطار کے آگے سینہ تان کے وردی پہن کے پگڑی باندھ کے کیمرے کی کھینچی ہوئی چکنے کاغذ کی تصویر بھیجی ہے۔ ہماری ہیئت کذائی ملاحظہ ہو تصویر لانا ہی بھول گئے۔ ہمیں پتہ تھوڑی تھا۔ ادھر دکھانی پڑے گی۔ اللہ خیر کرے اگلے ہفتے اپنی نیک بخت کے ہمراہ ریشمی رومال پہ زعفران سی لکھی عرضداشت لے کر حاضری دیں گے۔ ساتھ تصویر لیتے آئیں گے۔

قصہ مختصر، شادی طے ہو گئی۔

دلارے میاں چھٹی پہ آئے۔ جھٹ منگنی پٹ بیاہ ہو گیا۔ ارجمند بانو بیاہ کے دہلی سے علی گڑھ چلی گئی۔ چند مہینوں بعد دلارے میاں کی چھٹی ختم ہو گئی۔ وہ اپنی پلٹن میں

اجمیر گیا۔ اجمیر سے اس کی پلٹن ملیر چلی گئی۔ کراچی بندرگاہ سے ایک بحری جہاز پہ پلٹن سوار ہوئی اور یورپ محاذ پہ لڑنے روانہ ہو گئی۔ پہلی جنگ عظیم کے دن تھے۔ مہینوں تک دلارے میاں کی کوئی خبر نہ آئی۔ کوئی سوا سال بعد ارجمند بانو کو علم ہوا کہ دلارے میاں فرانس کے ایک ساحل پہ جنگ لڑ رہے ہیں۔ مگر ارجمند بانو کو یہ سمجھ نہ آئی فرانس کہاں ہے۔ جن دنوں فرانس سے دلارے میاں کا اپنے ابا صفدر میر کے نام لکھا ہوا خط ارجمند بانو تک پہنچا۔ اس کے سسرال میں حالات یکسر تبدیل ہو چکے تھے۔ ارجمند بانو کے سسر صفدر میر ایک ناگہانی موت مر گئے تھے۔

مقدمہ جیت کے آئے۔

چھت پہ چڑھ کے موم بتیوں کا بنڈل پکڑ کے چراغاں کرنے کے لیے جلا جلا کے موم بتیاں رکھتے جا رہے تھے کہ پاؤں پھسل گیا۔ یا شاید کوئی چکر آیا۔ دوسری منزل کی چھت سے نیچے صحن کے پکے فرش پہ گرے، گرتے ہی مر گئے۔

گھر میں کہرام مچ گیا۔

کہاں تو خوشی سے چراغاں ہو رہا تھا۔

پکوان پک رہے تھے۔

خیرات بانٹی جا رہی تھی۔

لوگ مبارک باد دینے آ رہے تھے۔

کہاں سب کچھ فنا ہو گیا۔

سال ہا سال سے جو شخص رتی رتی کر کے خوشی اور کامیابی جمع کرتا آ رہا تھا۔ تنکا تنکا جوڑ کے جو گھروندا بنانے میں جتا تھا، ایک ہی جھٹکے سے وہ ختم ہو گیا۔ گھر میں دور دور تک اندھیرا رہ گیا۔ کمانے والا بھی وہ اکیلا آدمی تھا۔ دلارے میاں کی تنخواہ وقت پہ پہنچنے لگی تو چولہا جلتا رہا۔ جلد سازی کی دکان بند ہو گئی۔ کچھ دکان کا کام صفدر میر کی بیوہ گھر پہ کرنے لگی۔ ارجمند بانو اور زیتون اس کا ہاتھ بٹاتیں۔ ارجمند بانو کی دونوں

بیاہی نندیں بھی گاہے گاہے ادھر آ جاتیں۔ گھر کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ رفتہ رفتہ ان پہ قرض بھی چڑھنے لگا۔ گھر میں تین خواتین تھیں۔ تینوں ٹوٹی ہوئیں خالی صراحیوں کی طرح تھیں۔ خالی برتن بجنے لگے۔ ارجمند بانو کی ساس جو شرینی سے بھرے تھال میں باتوں سے لڈو چنا کرتی تھی ایک دم سے زہر سے بھری پٹاری بن گئی۔ بات بات پہ کاٹ کھانے کو لپکتی۔ کبھی گھنٹوں چپ چاپ بال کھولے آنکھیں دیوار سے لگائے پتھر بنی گم سم بیٹھی رہتی۔ کبھی اٹھ کے بیٹی اور بہو کو گلے لگا کے رونے لگتی۔ دہلی سے لال خان اور اس کی بیوی چاند بیگم مہینے دو مہینے بعد جا کے بیٹی کو مل آتے۔

آگے کی ساری کہانی تو ارجمند بانو نے خود بتی ہے۔ یہ کہاں اس نے اپنے باپ سے سنی ہو گی۔ اگر سن پاتی تو اسے شاید احساس ہوتا کہ کبھی کبھی کوئی کہانی ایسی بھی ہوتی ہے جو کسی نہ بیتنے والے کو زیادہ بیتنی پڑتی ہے۔

اس لیے میری جان۔

صرف بیتی ہوئی کہانیوں کی سند مانگتے مانگتے، نابیتی ہوئی سہی کہانیوں کے دکھ سے نابلد نہ رہ جانا۔ جو ایسی تقدیروں سے عبارت ہوتی ہیں جن کی لکیریں بھی اپنے ہاتھوں میں نہیں ہوتیں۔

خدا نہ کرے، کوئی کسی اور کی بری قسمت کو جینے لگے۔

قسمت کی لکیر کسی دوسرے ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی ہو، اور بن وہ اپنی قسمت جائے۔

تمہیں ابھی بھی بات سمجھ نہیں آئی جو میں سمجھانا چاہتا ہوں۔

شکر ہے۔

یہ بھی اچھی بات ہے کہ تمہیں شطرنج کھیلنی نہیں آتی۔ ورنہ تمہیں معلوم ہوتا کہ کبھی کبھی اپنی پوری بساط دوسرے کی ایک چال سے اکھڑ جاتی ہے۔

اس لیے شاید شطرنج کھیلنے والے بہتر جانتے ہیں کہ "وہ" جو اوپر آسمانوں پہ بیٹھا دونوں طرف کی چالیں چلتا ہے۔ صرف وہی ہر بازی جیتتا ہے۔

ہر حال میں جیتنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ ہم اس کی ہر چلی چال کو اپنی سمجھ لیں اور جو اس کی رضا ہے اس سے راضی ہو جائیں۔

خوش نصیبی شاید اسی لیے اپنے نصیب سے خوش رہنے کی بات لگتی ہے۔

اسی لیے کہتا آ رہا ہوں، کہ خوش نصیب وہ ہے جو اپنے نصیب سے راضی ہو۔

کیوں کیا خیال ہے؟

بولو نا۔ میری خوش نصیبی۔

میری شطرنج بساط پہ ابھی نہ چلی ہوئی میری چال۔

□

دہلی کی آخری کہانی

ارجمند بانو کے نصیب میں کیا رہ گیا تھا کیا نکل گیا تھا، وہ اس سے بے خبر تھی۔ تین سوا تین سال سے وہ سسرال سے آئی اپنے باپ لال خان کے گھر، دہلی میں رہ رہی تھی۔ شروع میں تو وہ صرف اس لیے اپنے میکے آئی تھی کہ زچگی سے تھی، اس کے سسرال میں اس سے امید بندھی تھی کہ بیٹا پیدا ہوگا۔ بیٹی پیدا ہوگئی تو سسرال سے کوئی اس کا حال احوال پوچھنے ہی نہ آیا۔ سسرال میں تھا بھی کون، دو بیاسدھاری نندیں پیچھے گھر میں ایک ساس تھی ایک نند۔ نند کو ساس نے پڑوس میں انہی صرافوں کے گھر بیاہ دیا تھا جن سے مدتوں ایک احاطے کا مقدمہ چلا تھا۔ بیاہ کے بعد صرافوں نے اس احاطے کے ساتھ ساس کے باقی ڈھائی کمروں کے گھر کو بھی اپنے مکان میں ملا لیا۔ ساس پہلے ہی اندر سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ میاں اس کا مر گیا تھا۔ اکلوتا بیٹا جنگ میں لڑنے یورپ گیا تو برس ہا برس سے اس کی کوئی خبر نہ آئی۔ شروع میں تو وہ گھر والوں کے لیے اچار، چٹنی اور بڑیاں بنا دیتی۔ پیڑھی کھینچ کے بیٹھی آلو چھیل دیتی۔ کپڑا بچھا کے مٹر کے دانے نکال دیتی۔ پھر جب پیسے والے پڑوسیوں میں بیاہی اس کی بیٹی زیتون نے بھی اس سے مالک مکان بن کے بات کرنا شروع کر دی تو وہ ایک کونے میں سمٹ گئی، چھالیا کترلیتی پھر بیٹھی چھالیا منہ میں رکھتے سے کڑوی کھٹی باتیں کرتی رہتی۔ اس کی زیادہ

ترصلواتوں کا رخ ارجمند بانو کی طرف ہوتا جو اس سے دور دہلی میں اپنے باپ کے گھر، اس کے خیال میں راج کر رہی تھی۔

ارجمند بانو نے راج پاٹ کیا کرنا تھا۔

گھر گرہستی سنبھالے ہوئی تھی۔

دو اس کے چھوٹے بھائی تھے۔ باقر اور اکرم۔ ایک گیارہ برس کا تھا دوسرا نو سال کا۔ ان دونوں کو لے کر وہ شام کو بیٹھ جاتی۔ قاعدے کتابیں نکال کے پڑھاتی رہتی۔ خود تھوڑی بہت پڑھی تھی۔ مگر بچوں کے لیے وہ مکمل استانی تھی۔ اس کی اپنی بیٹی بھی پونے تین سال کی ہونے لگی تھی۔ بھاگی دوڑی پھرتی۔ باورچی خانے میں وہ کام کرتی تو اس کی بیٹی اسے گلاس، چمچہ، پلیٹ اٹھا کے پکڑا دیتی۔ اس کی ماں چاند بیگم، ارجمند بانو کے گرہستی میں ہاتھ بٹانے سے خوش نہ تھی۔ وہ تو اسے اپنے اور اپنی بیٹی کے نصیب میں براشگون سمجھتی تھی۔ رات دن اسے یہی اندیشہ کھائے رہتا کہ کب ارجمند بانو اپنے سسرال سدھارے گی۔ کب اس کا میاں جنگ سے پلٹ کے آئے گا۔

خدا جانے وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔

وہ بیٹی کو دیکھ دیکھ کے ٹھنڈی آہیں بیٹھی بھرتی رہتی۔ گلی محلے میں جب کبھی وہ کسی فوجی سپاہی کو دیکھتی، اس سے اپنے داماد دلارے میاں کا احوال پوچھنے بیٹھ جاتی۔

ایک دن کسی نے اسے بتایا کہ دلارے میاں زندہ ہے اور ایک بحری جہاز سے کراچی بندرگاہ پہ اترا ہے۔ ان کے گھر میں ایک دم سے تہوار کا سا سماں ہو گیا۔ لڈو شرینی بٹنے لگی۔ پکوان پکنے لگے۔ ارجمند بانو نے جلدی جلدی میں اپنے دو چار جوڑے سی لیے۔

پھر کسی نے خبر دی کہ وہ بیمار ہے۔

جنگ میں زخمی ہو گیا تھا۔

ایک ٹانگ بارود سے زخمی ہو گئی تھی۔ ٹانگ کاٹنی پڑ گئی۔

ابھی زیر علاج ہے۔

ملیر کے فوجی ہسپتال میں ہے۔

گھر میں سراسیمگی پھیل گئی۔

ارجمند بانو کو یہ سمجھ نہ آئے کہ کون سی ٹانگ اس کے میاں کی کاٹی گئی۔ دائیں یا بائیں۔ ماں اس کی، اس کے باپ سے بار بار پوچھے، کسی سے پوچھ کے آیئے، ٹانگ کٹی کدھر تک ہے۔ گھٹنے سے نیچے یا اوپر۔ لال خان پریشانی میں ہاتھ ملتا پھرے۔ میں کس سے پتہ کروں۔ ارجمند بانو کے سسرال، علی گڑھ کسی کو بھجوا کے پتہ کروایا۔ پتہ چلا دلارے میاں کی آمد کی اطلاع ادھر پہنچ گئی ہے۔ لال خان اگلے دن ہی ارجمند بانو اور اس کی بیٹی کو لے کر علی گڑھ پہنچ گیا۔ ارجمند بانو کے سامنے دلارے میاں گھر آیا۔ ارجمند بانو نے دلارے میاں کو دیکھا تو لرز گئی۔

اس سے پہچانا نہ گیا۔

جسم سوکھ کے ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔

چہرے پہ دو تھکی ہوئی ٹمٹماتی آنکھیں تھیں۔

جیسے ختم ہوئے تیل والے سوکھے چراغ کی بتیاں لرز رہی ہوں۔

چہرے پہ گڑھے پڑے تھے۔ خشک بھدے پپڑی جمے ہونٹوں پہ نیلی نیلی چھائیاں تھیں۔ جسم کیا تھا ہڈیوں کی گٹھڑی تھی۔ بانس جیسے پتلے سوکھے بازو، کندھوں سے نیچے لٹک رہے تھے۔ پیٹ پچکا ہوا تھا۔ کمر میں انگریزی خاکی نیکر تھیلے کی طرح بندھی جھول رہی تھی۔ دائیں ٹانگ سلامت تھی۔ اسی ٹانگ کے نیچے سوکھے چمڑے پہ ڈھلکی ہوئی خاکی جراب میں چھپے لکڑی جیسے سکڑے ہوئے ایک پاؤں میں ٹیڑھا سا پہنا میلا فوجی جوتا تھا۔ بائیں ٹانگ گھٹنے سے اوپر کٹی تھی۔ ڈھیلی نیکر کا بائیاں پائنچہ گھٹنے کے اوپر تک رول کیا ہوا تھا۔ مڑی ہوئی نیکر کے کھلے جھولتے پائنچے میں کٹی ہوئی ران کے سرے پہ روئی کا پھاہا رکھ کے بڑی سی گدلی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پٹی کا رنگ کلیجی جیسا

تھا۔ زخم سے بدبو ایسی شدید اٹھ رہی تھی جیسے پھاہے کے اندر کوئی مرا ہوا چوہا بند ہا ہو۔
چھوٹا سا صحن ایک دم سے لوگوں سے بھر گیا۔
دلارے میاں کو صحن میں چارپائی بچھا کے سرہانے سے ٹیک لگا کے لٹا دیا گیا۔
لوگ آ آ کر اس کے سینے پر اپنا سر رکھ کے رو رو کے اسے ملتے جاتے۔ وہ لیٹا لیٹا ہر ملنے والے کے سر اور گردن پر اپنا سوکھا ہڈیوں سے بھرا، لٹکی لٹکی کھال والا ہاتھ رکھ رکھ کے اپنی طرف سے جواب دیتا جاتا۔
دلارے میاں کی تینوں بہنیں موجود تھیں۔ ان کے بچے، خاوند اور دیگر رشتے دار بھی آ موجود ہوئے۔ دلارے میاں کی ماں اپنے بیٹے کو اس حال میں دیکھ دیکھ کے روئے جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو رہے تھے۔ اسے دیکھ کے لگتا تھا، اسے سمجھ نہیں آ رہی کیا کرے۔ وہ کبھی بیٹے کے زندہ لوٹ آنے کی خوشی میں باآواز بلند خدا کا شکر ادا کرنے لگتی، کبھی بیٹے کی کٹی ٹانگ اور پژمردہ حال دیکھ کے بین کرنے کے انداز میں رونا شروع کر دیتی۔ ارجمند بانو دور کھڑی دیکھتی رہی۔ کئی بار اس نے ساڑھی کے پلو کا گھونگھٹ پھیلا کے، آنکھیں پونچھتے ہوئے اپنی بیٹی اکبری کو انگلی سے لگا کے ہجوم میں سے دلارے میاں تک پہنچنے کے جتن کیے۔ کوئی دو ڈھائی گھنٹے بعد وہ اپنے خاوند کی پراندی پہنچی۔
تین سالہ اکبری ماں کے ساتھ ساتھ گھسٹتی آئی۔ اس بچی کے کان میں بار بار بانو جھک کے روتے ہوئے کہتی تیرے ابا ہیں۔ انہیں سلام کرو۔ بچی چارپائی پر لیٹے بیمار آدمی کی ہیبت دیکھ کے ڈرے جا رہی تھی۔ اوپر سے چھوٹے سے صحن میں لوگوں کا ہجوم۔ بھانت بھانت کی باتیں، بچی اپنے باپ کی پرائنتی پہنچی تو چارپائی کے نیچے پڑے دلارے میاں کے ایک پرانے پھٹے فوجی جوتے کو اٹھا کر اپنی امی سے پوچھنے لگی،
دوسرا جوتا کدھر ہے امی؟
بانو نے اکبری کے ہاتھ سے جوتا لے کر اسے گلے سے لگا لیا اور پھر اونچی اونچی

رونے لگی۔ روتے روتے بانو نے دلارے میاں کے داہنے پاؤں کو چھو کے اپنے ہاتھ چومے جیسے کسی درگاہ کی چوکھٹ ہو۔ دلارے میاں کا پاؤں درگاہ کی سل کی طرح ٹھنڈا تھا۔ بانو کے جسم میں ٹھنڈ کی لہر سر کی پشت سے ہوتی ہوئی اس کی پوری ریڑھ کی ہڈی کے بیچوں بیچ گزرتی پورے جسم کی بوٹی بوٹی میں پھیل گئی۔

اکبری کو اٹھائے اٹھائے سنبھالتی ہوئی، چارپائی کی ایک طرف سے ہوتی ہوئی دلارے میاں کے قریب پہنچی اور آداب کہہ کے اکبری کو اس کے برابر بٹھا کے بولی،

آپ کی بیٹی ہے۔

اکبری۔

دلارے میاں کی مٹیالی دھنسی ہوئی آنکھوں میں ایک دم سے بجی سی جلی اور اس نے اپنے دونوں بازو اٹھا کے اکبری کو ہاتھ کھینچ لیا۔ اکبری باپ کی گرفت میں آتے ہی ایک دم سے اونچی اونچی رونے لگی۔ ارجمند بانو نے بیٹی کو چارپائی سے اٹھا لیا اور ادب سے جھک کے دلارے میاں کے ماتھے پر پھیلا کے اپنی ہتھیلی رکھی۔ ماتھا گرم تھا۔ ارجمند بانو نے ہتھیلی اٹھا کے ہاتھ کی پشت سے دلارے میاں کا بخار جانچا۔ وہاں سے ہٹتے ہوئے وہ اپنے خاوند کی کٹی ہوئی ٹانگ کے پاس سے گزری تو سرانڈ کا ایک بھبھکا اٹھا۔ اس نے اپنی آنکھیں پونچھتے پونچھتے ساڑھی کا پلو ناک پر رکھ لیا اور زیرلب بولی انہیں تو بخار ہے۔ چارپائی کے چاروں طرف کھڑی عورتوں میں بھیں بھیں کر کے باتیں شروع ہو گئیں۔

ایک بولی لو، دلارے میاں کی دلہن کو اب خبر ہوئی ہے، بخار کی!

اے چلو اماں آپ کی بہو رانی نے ہاتھ تو رکھا دلارے میاں کے ماتھے پر۔

اے چل ہٹ بڑی آئے ماتھے پر ہاتھ رکھنے والی ویدنی۔

خدا کا قہر چار سال بعد سات سمندر پار سے خاوند گھر پہنچے اور رانی بہو ناک پر پلو رکھتی پھریں۔

حیا نہیں آتی نگوڑی کو۔
چلو بھر پانی میں ناک ڈبو کے جا مرے۔
اے آپا کس رانی کی بات کر رہی ہیں انہیں کس کا انتظار تھا۔
انہوں نے کب میاں کی راہ دیکھی۔
میاں گیا تو یہ جا وہ جا۔
چار برس اپنے باپ کے گھر راج کیا۔
یہ ان میں سے تھوڑی ہیں جو ساس کی خدمت کرتیں۔
اے اللہ بچائے' انہوں نے تو ایک بار پانی بھی نہ پلایا گلاس میں ہماری ماں کو۔
اب آ گئی ہیں بیٹی کو انگلی سے لگا کے۔
خدا جانے کس کا گناہ ہمارے بیٹے کے سر منڈھنے آ گئی ہیں۔
اے بہن! ایسے نہ کہہ۔
اے لو میں ڈرتی ہوں اس کے کارخندار باپ سے۔ ساہوکار ہوگا اپنے گھر۔ بیٹی کو چار سونے کے کنگن تو دے نہ سکا۔ یہ سوا سو تولے پتلی پتلی چوڑیاں پہن کے آئی تھی بیاہی۔ جاتے ہوئے حاتم طائی کی قبر پر لات مار کے اپنی نند کو دے گئیں۔ لے دیکھ بہن' زیتون کے نصیب' اس کے بھاگ میں تو سناروں کی بہو بننا لکھا تھا۔ ان دو ٹکوں کی چوڑیوں کی کیا اوقات ہے اب زیتون کے آگے۔
چلو آپا' آپ کیوں ایرے غیرے کے منہ لگتی ہیں۔
چار حرف بھیجئے۔ معلوم نہیں کیا آپ کو۔ کس لیے تشریف لائی ہیں آپ کی بہو رانی۔
آپ فکر نہ کیجیے بہن' ایک پائی کی بھی حق دار نہیں ہیں۔ اپنی جان پر کھیل کے ہمارا بیٹا اشرفیاں لے کر آیا ہے۔ ایسے ویسوں کو تو خیرات بھی نہ دوں۔
بانو کی آنکھوں میں آنسو رکے رکے تھے۔ یہ صلواتیں سن کے تیزی سے بہنے

لگے۔ آنسوؤں کی بھیڑ میں اس سے اپنے خاوند دلارے میاں کا چہرہ بھی ٹھیک سے نہ دیکھا جائے۔ سر پر ڈھیلی سی خاکی پگڑی لپیٹے وہ چت چارپائی پر شانے کھاٹ سے لگائے پڑا تھا۔ اس کے چہرے پہ لگی خراشوں اور ہڈیوں کے گڑھوں کے اندر رکھی ہوئی؛ اوپر آسماں کو تکتی میلی آنکھوں پر مکھیاں جھپٹے جا رہی تھی۔ دلارے میاں کبھی کبھار اپنا دائیاں ہاتھ سینے سے اٹھا کے مکھیاں اڑانے کی کوشش کرتا ورنہ مکھیوں کو اپنے زخم چاٹنے سے منع نہ کرتا۔ جیسے اس میں مکھیاں چہرے سے اڑانے کا دم نہ ہو، یا مکھیوں کے پیروں کی سرسراہٹ اسے چبھتی نہ ہو۔ اس کی قمیض بدن پر ڈھیلی ہو کے اس کی کمر کے ایک طرف اکٹھی ہو گئی تھی۔ سیدھا لیٹنے سے اس کا پیٹ زیادہ پچکا ہوا نظر آتا تھا۔ سینے کی پسلیاں قمیض کے اندر سے بھی گنی جا سکتی تھیں۔ سینے سے نیچے، پیٹ کے گڑھے اور کولہے کی ابھری ہوئی ہڈیوں کے پاس ایک دھاری دار سفید اور زرد رنگ کی چادر پڑی تھی۔ جو اس کی رانوں کے اوپر سے ہوتی ہوئی اس کی بائیں کٹی ہوئی ران کے زخم کے پاس اکٹھی ہوئی پڑی تھی۔

دلارے میاں اپنی چارپائی کے اردگرد ہونے والی باتوں سے بے نیاز سیدھا لیٹا آسمان تکے جا رہا تھا۔

آسمان پر ایک چیل اڑی جا رہی تھی۔

کبھی کبھی وہ اڑتی اڑتی غوطہ مار کے نیچے آتی۔ اپنے بڑے بڑے پر پھیلا کے آہستگی سے دو تین چکر ان کے صحن کے اوپر لگاتی پھر ایک طرف کو نکل جاتی۔ آسمان شفاف نیلا تھا۔ بادل کا ایک بھی ٹکڑا آسمان پہ نہیں تھا۔ سورج مغرب کی طرف جھکتا ہوا صحن کی مغربی دیوار کے ساتھ لگے پیپل کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ پیپل کے پتے اپنی لمبی لمبی ڈنڈیوں میں لٹکے ہوئے شام کی ہوا میں اک اک کر کے ہلے جا رہے تھے۔ سورج کی کرنیں پیپل کے پتوں اور ٹہنیوں کے اندر سے گزرتی ہوئی انہیں ایسے چمکا رہی تھیں، جیسے سورج پیپل کے اندر آنکھ کھولے بیٹھا ہو اور اس کی کرنیں پیپل کے

پتوں کی ڈنڈیوں سے لپٹ کے تالیاں بجا رہی ہوں۔ ارجمند بانو کو روتے روتے رات ہو گئی۔

رات کے بعد صبح ہوئی۔ دن چڑھا۔ یوں کئی ہفتے گزر گئے۔

دلارے میاں کو وہ لوگ ویدوں، حکیموں اور ڈاکٹروں کے پاس لیے پھرتے رہے۔ کٹی ہوئی ران کا زخم اچھا نہ ہوا۔ زہر جسم میں پھیلتا گیا۔ پوری بائیں ران کی جلد کالی ہو گئی۔ پیاز کے چھلکے کی طرح وہ خود بخود اترتی رہی۔ مردہ ہوتی کٹی ٹانگ کے اندر بدبو بڑھتی گئی۔ سرکاری ہسپتالوں والے کہتے ٹانگ اوپر کولہے کے جوڑ سے کاٹنی پڑے گی۔ دلارے میاں کی ماں نہ مانی۔ آخر دلارے میاں مر گیا۔ اسے مرے چوتھا دن تھا کہ بانو کی نندوں نے اسے اس کے کپڑوں کی گٹھڑی لا کے ہاتھ میں دی اور اس کی بچی اکبری کو کندھوں سے دھکیل کر اس کی طرف کیا اور ہاتھ سے پکڑ کے گھر سے باہر نکال کے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ بانو کا باپ لال خان، داماد کی وفات کا سن کے تعزیت کے لیے ادھر آیا ہوا تھا۔ عصر کی نماز پڑھنے وہ ان کے گھر سے مسجد تک گیا تھا۔ پلٹ کے گلی میں آیا تو دیکھا' دروازے کی چوکھٹ کے پاس مٹی میں ساڑھی کی تھچی مچی ہوئی گٹھڑی بنی سر نہوڑے بے دم ہوئی اس کی بیٹی ارجمند بانو بیٹھی ہے پاس نواسی اکبری کھڑی اپنی ماں سے لپٹی ہوئی روئے جا رہی ہے۔ قریب ہی دھول میں گری ارجمند بانو کی ایک پرانی ساڑھی میں بندھی پوٹلی پڑی ہے۔

گلی کے اکادکا چلتے لوگ رکے کھڑے تھے۔

ایک کتا پیپل کے درخت کے نیچے دیوار سے اچھل کر درخت پر چڑھتی ایک گلہری کو تھوتھنی اٹھا کے تک رہا تھا اور اپنی دائیں پچھلی ٹانگ اٹھا کے اپنے پیٹ پر خارش کر رہا تھا۔ لال خان نے لپک کے اپنی بیٹی ارجمند بانو کو کندھوں پر ہاتھ رکھ کے اٹھا لیا۔ وہ دھاڑیں مارتی ہوئی اپنے باپ سے لپٹ گئی۔

لال خان نے اپنے کندھے کے صافے سے بیٹی کی آنکھوں کو پونچھا۔ اس کی

دھول میں اٹی ہتھیلیوں کو اپنے سینے پہ ململ کے پہنی ہوئی واسکٹ سے صاف کیا۔ اس کا ماتھا چوما اور سر پر ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے اپنی سفید لٹھے کی ڈھلی ہوئی دوپلڑی ٹوپی کو کھینچ کے اپنے آنکھوں کے آنسو پونچھے اور اپنی نواسی کو گود میں اٹھا کے بیٹی کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اور گلی سے باہر کی طرف چل پڑا۔

بانو کے پاس پھینکی ہوئی گٹھڑی کسی نے نہ اٹھائی۔

گلی میں رکے کھڑے چند لوگ خاموشی سے سارا منظر دیکھتے رہے۔ دیوار کے ساتھ پیپل کے نیچے کھڑا خارش کرتا کتا اپنے اگلے پنجوں سے آہستہ آہستہ بڑھتا زمین پر گری پڑی میلی سی ساڑھی میں بندھی گٹھڑی کو اپنے پنجوں سے الٹ پلٹ کر، اپنی تھوتھنی اس کے قریب لا کے زور زور سے سانس لے کر اسے سونگھنے لگا۔

ارجمند بانو اپنی بیٹی کے ساتھ ہمیشہ کے لیے اپنے باپ کے گھر دہلی میں آ گئی اور یوں دل جمعی سے وہاں رہنے لگی جیسے وہاں سے کبھی کہیں گئی ہی نہ تھی۔ گھر میں ذرا سکھ کی لہر آئی تو لال خان کو کاروباری معاملات میں الجھنیں گھیرنے لگیں۔

لال خان نے اپنی جمع پونجی اکٹھی کر کے شہر کے باہر جمنا کے کنارے ایک کارخانہ لگایا تھا۔ بنگال اور پنجاب سے ململ اور لٹھے کے تھان آتے۔ وہ ٹھپائی کا کام ان پر کرتا۔ اس کا چھوٹا بھائی کالے خان، جس کا بیاہ اس کی بیوی چاند بیگم نے بڑے چاؤ سے اُسی محلے میں کیا تھا وہی ان کو راس نہ آیا۔ پہلے تو کالے خان کی بیگم نے اپنے میاں کو بڑے بھیا کے گھر سے نکال کے الگ گھر لیا۔ پھر کارخانے میں بھی دیوار کروا دی۔ مسئلہ یہ تھا کہ کالے خان کی بیگم ساحرہ اس گھرانے میں اپنی دوسرے نمبر کی حیثیت کو ذہنی طور پر قبول نہ کر پائی تھی۔ یہ کیا بات ہوئی ہر بات میں بڑی بیگم صاحبہ۔ کوئی فیصلہ کرنا ہو بڑے بھائی۔ ہم کیا کیڑے مکوڑے ہیں۔ ہماری کوئی حیثیت نہیں۔ وہ کالے خان کے دماغ میں دیمک کی طرح چمٹ گئی۔ کالے خان شکل کا اتنا کالا نہیں تھا جتنا اندر سے میلا تھا۔ وہ خود ہی گھر میں آتے ہی کوئی نہ کوئی شرارت چھیڑ دیتا۔ خود

ہی اپنی بیگم سے کوئی قصہ شروع کر کے بیٹھ جاتا۔

لو جی آج بنگال سے آئی ململ کے ستر دھان رنگے گئے'

رنگوں کی ترتیب میں نے بنائی۔ میرے حصے میں صرف دھلائی کے پیسے آئے اور جان ماروں تو استری کے دو پیسے مل جائیں گے۔ آخر ٹھپائی تو صرف بڑے بھیا کے کارخانے میں ہوتی ہے۔ کہنے کو احاطہ سارا انہوں نے میرے نام کا خریدا ہوا ہے۔ کسی سرکاری اہل کار سے پوچھو' تو مالک تو میں ہوا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ خریدتے سے کس نے اپنے پلّے سے پیسے دیئے تھے۔ پیسے تو انہیں کے پاس ہونے تھے، وہی بڑے تھے۔ میرے پاس کیا تھا۔ میں تو دونی چونی ان سے لے کر قلفی چاٹ کھاتا تھا۔ بڑا تیر مارا' لوگوں کو دکھانے کے لیے' کہ چھوٹے بھائی سے بڑا پیار کرتے ہیں۔ شری رام بنے ہوئے ہیں۔ مجھے لچھمن بنا کے رکھا ہے۔

میرے نام سے احاطہ خرید لیا۔

کاغذوں میں مجھے مالک بنا لیا'

حیثیت نوکروں سے بھی بدتر۔ پچھلے دنوں آپ کے کہنے سے' کتنے شور شرابا کے بعد سارا کام الگ تو کر دیا مگر احاطے میں ایسی دیوار ماری کہ ہماری طرف ٹین کی چھت کے دو کمرے دیے۔ خود شہتیروں والا بڑا کمرہ رکھ لیا۔ ایک ہی صحن میں شہتوت کا پیڑ تھا۔ وہ بھی ان کی طرف چلا گیا۔ نلکا ہماری طرف رہ گیا۔ چو بچہ خود لے گئے۔ لے ہم پوچھیں اس تقسیم کا کیا دکھاوا۔ پورے احاطے کی ملکیت تو ہمارے نام ہے۔

کچہری میں جا کے دو وکیلوں کے رو برو اقرار نامہ لکھا ہوا ہے۔ وہ تو ہماری قسمت بری ہے کہ وہ کاغذ آج تک ہمارے ہاتھ نہیں لگا۔

بھیا نے ہی کہیں سنبھال کے رکھا ہوا ہے۔

ساحرہ کو جب یہ راز پتہ چلا تو وہ اکڑ کے چوبارے جتنی اونچی ہو گئی۔

اکڑ کے کھڑی شہتیری بن گئی۔

ہک پر ہاتھ رکھ کے اپنے میاں کو ڈانٹنے لگی۔

یہ کیا بات ہوئی۔

مالک ہم ہیں اور راج وہ چاند بیگم کریں۔

اوپر سے اس کی رنڈی ارجمند بانو پلے پڑی ہے۔ ہم تو کہتے ہیں کچہری میں دو چار پیسے دے دلوا کے کسی طرح ملکیتی سند کی کاپی نکلوائیے اور کان سے پکڑ کے ان لوگوں کو کارخانے سے باہر کریں۔ ہماری کیا اولاد نہیں ہے۔ ساحرہ بیگم کی ماں اسی محلے کی تھی۔ چہرے پہ جھریوں اور چھائیوں کی وجہ سے نہیں، بلکہ من کے میل کی وجہ سے اس کی شکل ڈراؤنی سی لگتی تھی۔ ایسی ایسی چالیں وہ اپنی بیٹی ساحرہ کو پڑھاتی کہ کبھی کبھی تو ساحرہ بھی چکرا جاتی۔ بات بات پہ ساحرہ' چاند بیگم سے آ کے الجھ جاتی۔ ارجمند بانو کو تو بات بے بات صلواتیں سنا جاتی۔ پھر کبھی آتی تو ایسی چکنی چپڑی باتیں کرتی کہ چاند بیگم اور ارجمند بانو دانتوں میں انگلیاں دیئے اسے دیکھتی رہتیں۔

کیا شاندار قورمہ پکا رہی ہیں آپ بھابھی۔

یہ گلزار پلاؤ ہے یا نوتن پلاؤ۔

ہائے خوشبو تو اس کی موتی پلاؤ جیسی ہے۔

کیا پتہ تولہ بھر چاندنی کے ورق اور ماشہ بھر سونے کے ورق لگا کے انڈوں کی زردی میں حل کر کے آپ نے آبدار موتی مرغے کے زخرے میں بند کر کے جوش دیا ہو۔ یہی ترکیب بتائی تھی نہ موتی پلاؤ کی۔

کیا یہی پک رہا ہے؟

بھابھی! ہم تو یہیں رکاب بھر ہاتھوں ہاتھ کھا کے جائیں گے۔

آپ تو ہمیشہ رکابی بھر کے ہمارے گھر ہر پکا کھانا بھیجتی ہیں۔ لیکن وہ تو آپ کے دیور کالے خان اکیلے ہی چٹ کر جاتے ہیں۔ اپنا حصہ تو ہم آج کھا کے جائیں گے کیوں بیٹی بانو۔ یہی آپ کے دسترخواں کی رکاب دار ہیں نا' آج کل۔

ہاں چچی آپ تشریف رکھئے۔
میں دم دے کر ابھی ورق لگا کے پلاؤ حاضر کرتی ہوں۔
کھاپی کے ساحرہ اپنے گھر رکابی بھر کے پلاؤ لے جاتی تو ادھر اپنے میاں کالے
خان کو آڑے ہاتھوں لیتی۔
ناک تو کام کر رہا ہوگا۔ کیسی خوشبو آ رہی ہے۔
آپ کے بھائی صاحب کے گھر سے لائی ہوں۔
نوابی شان کے پلاؤ کی خیرات۔
لیں آپ بھی چکھ لیں۔
پورے محلے میں اس پلاؤ کی خوشبو کا اخبار بٹ گیا ہے۔
اجی کیوں نہ ہو۔
بھائی کا حصہ مار کے ہانڈیاں چڑھتی ہیں۔
پکوان پکتے ہیں۔
ابھی کچھ دن ہوئے جمعرات کی شام پستے اور بادام کی کھچڑی ادھر پکی تھی۔
پچھلے سوموار تنجن پکایا تھا نواب زادیوں نے۔
بریانی تو ہر تیسرے چوتھے دن ادھر پکتی ہے۔
آبدار خانے کے ناندے میں مٹھیاں شورے کی ڈال ڈال کے تانبے کی
صراحیوں کا پانی یخ کر کے پیا جاتا ہے ادھر۔
ادھر ہمارے نصیب میں چٹکی بھر شورہ نہیں۔ گرم پانی پیو مرو۔
وہ تو جی لال قلعے کی پلی ہوئی شہزادیاں ہیں۔ ہماری جوتی سے بھی کم شکل'
نگوڑیاں۔
نام دیکھو کیا رکھے ہیں۔ ایک چاند بیگم ہیں دوسری ارجمند بانو۔ واہ واہ۔
جیسے شہنشاہ کی پتریاں ہوں۔

شہنشاہ تو مر گئے۔ یہ لاٹ صاحب کی بیگموں کا راج نہ گیا۔
میاں مر گیا منحوس ارجمند بانو کا۔
پر ہم سے اچھے نصیب ہیں۔
باپ کماتا ہے بھائی کو لوٹ لوٹ کے۔
کھلاتا ہے۔
ایک ہم ہیں۔
میاں کے ہوتے ہوئے رنڈیوں سے کم نصیب پایا ہے۔
مر ہی جاتا ایسا کم ہمتا میاں تو صبر آ جاتا۔
کہنے کو مالک ہے سارے کارخانے کا۔
بے قوف۔
آج تک ملکیتی کاغذ ہی ہاتھ نہیں آیا۔
ہمارے ہی نصیب مرے ہوئے تھے جو ان کے پلو آ بندھے۔
منحوس ماری موت آ جاتی' ان کے شادی کے پیغام آنے سے پہلے۔
وہی کٹنی۔ لالمبے منہ والی چاند بیگم گلابی گتے پہ زعفران سے سنہری حرفوں سے ہمارے لیے موت کا پیغام لکھ کے لائی تھیں۔ ابا مرحوم کی عقل بھی جواب دے گئی۔
ویسے تو بڑے میاں دیدہ ور بنتے تھے۔ انہی کی طشتری میں لڈو بھر کے بھیج دیئے۔
ہمارے نصیبوں پر مہر لگا دی۔
کالے منہ والے اس دو ٹکے کے بندے کے ساتھ ہمیں بیاہ دیا۔
جسے سارا زمانہ لوٹ کے کھا جائے۔
بازار میں دمڑی کا بیچو تو کوئی نہ خریدے۔
ہمارے پلے بندھ گیا۔
اللہ کے بندے اگر اپنا حق تو نے بھائی اور بھاوج ہی کو کھلانا تھا تو ہمیں ادھر

باندھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب تو ادھر وہ نگوڑی ڈائن بھتیجی بھی ہیں۔ ہم تو کہتے ہیں آپ خود شوق سے انہیں پال رہے ہیں۔

ایسا ہی ہے تو ہمیں کیوں میاں کاٹھ مار رکھا ہے۔

ہمارے لیے ایک سے بڑھ کے ایک رشتے پڑے تھے۔

بھول گئے وہ موتیا منزل کے وکیل زادے۔

دن میں اٹھارہ چکر لگاتے تھے ہماری بالکونی کے آگے۔ دیکھا ہے کیا بانکے جوان ہیں اب تک وہ۔ پانچ پانچ دن تک ان کے دالان میں مرغوں کی پالی سجے ہے۔ مشک اور زعفران کی گولیاں کھلا کے پالتے ہیں وہ اپنے اصیل مرغوں کو۔ کبھی دیکھا ہے۔ کس دھج سے پالی میں اتارتے ہیں۔ اپنا مرغا وہ۔

ہائے قسمت پھوٹی۔

ہم ہی نہ اتر سکے ان کی پالی میں۔

وہ جو گھائل مرغے کی قلغی منہ سے چوس چوس کے گھڑی پل میں اچھا کر دیتے ہیں ہمارے دل میں کیونکر کوئی گھاؤ رہنے دیتے۔

اِدھر تو روز ان کی بھاوج اور بھتیجی ہمارے سر پہ مونگری پھیرے ہے۔

کبھی نئی پوشاکیں آرہی ہیں گھر میں۔

خیاط گھر میں بٹھا کے انگیا سلائی جا رہی ہیں۔ چھت سے کنکوے اڑائے جاتے ہیں۔ قندیلوں کو ڈور سے باندھ کے اڑایا تھا پچھلی شب برات آپ کے بھائی نے۔ اور آپ ہیں کہ چار درجن گولے کبوتر چھت پہ رکھ کے اچھلتے رہتے ہیں۔ ہم تو کہیں ایک بار کا برا بننا اچھا۔ سیدھی طرح سامنے کھڑے ہو جائیے۔ دو حرفی بات کریں۔ میاں پورا کارخانہ ہمارا ہے۔ ہمارے نام لکھا ہے۔ جائیے فاختہ اڑائیے۔

پھر پوچھوں گی چاند بیگم اور اس کی رانڈ بانو سے۔

کدھر سے پلاؤ پکتے ہیں۔

منجن کس بھاؤ ملتا ہے۔آبدار خانے کہاں جاتے ہیں۔بہت ہوگئی۔

اب ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔ہم تو دو گھڑی میں سارے معاملے درست کر دیں۔لیکن پھر ہم ہی برے بنیں گے۔لوگ کہیں گے بھائی تو فرماں بردار ہے۔ بھاوج نے لگائی بجھائی کی۔فساد کھڑا کیا۔

فساد کھڑا کرے ہماری جوتی۔

لو پندرہ دن سے ٹوٹی ہوئی ہے یہ جوتی بھی۔

میاں کے سر پہ جوں نہیں رینگتی۔

ان کے بس میں ہو تو پاپیادہ رکھیں ہمیں۔جیسے گھر میں ان کی اماں پھرا کرتی تھی۔گلی میں کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔بیچ گلی میں آوارہ سانڈ کے سینگوں کی زد میں آ کے مریں۔

یہ ہے ان کی اوقات۔

ہماری قدر کہاں ہوگی۔

ہمارے ابا نے ہی جب ان دونکوں کے لوگوں میں ہمیں جھونک دیا ہے۔پھر ہم کس سے شکوہ کریں۔

ہائے ری قسمت۔

وہ وکیل زادہ تو اب بھی صدقے واری جائے ہے۔کہنے کو ہم چار بچوں کی ماں ہوگئیں مگر دیکھ کے کوئی کہے ہے ہمارا ایک سے زیادہ بچہ ہوگا۔کئی بار ان نگوڑے بچوں کو کہا ہے ہمارے ساتھ جڑ جڑ کے نہ گلی میں چلا کریں۔نہیں مانتے۔

ابا کی طرح موٹی عقل ہے ان چاروں کی۔

ان سب کی عقل میں کیسے آئے اتنی سی بات کہ میاں جب سارا کارخانہ ہمارے نام لکھا ہوا ہے تو ہاتھ سے پکڑ کے بھائی کو باہر کریں۔

لوگوں کی پڑی ہے۔کیا کہیں گے۔

مارو گولی انہیں انگریز کی۔
ہمیں کیا لینا دینا لوگوں سے۔
اگر لوگوں کا ہی ڈر ہے تو پھر میں بتاتی ہوں کیا کرنا ہے۔
ادھر آیئے'
چھوڑیئے یہ بھتیجی کے ہاتھ کا بھیجا ہوا پلاؤ۔
ادھر آ کے ہماری بات سنیں۔

کالے خان پلاؤ کی طشتری چھوڑ کے اپنی بیگم ساحرہ کے پاس جا کے بیٹھ جاتا ہے۔ ساحرہ چاروں طرف چوری نگہ سے دیکھ کے' کالے خان کے کان میں کچھ کھسر پھسر کرنے لگتی ہے۔ کالے خانے کا اپنی بیگم کی باتیں سنتے ہوئے چہرے پہ ایک رنگ آتا ہے ایک جاتا ہے۔ لگتا ہے وہ کسی بات کو سن کے بے حد ڈر گیا ہے۔
کچھ دن گزر گئے۔

ایک شام کو لال خان اپنے گھر آئے' ہاتھ منہ دھویا۔ وضو کیا نماز پڑھی۔ ارجمند بانو دستر خوان پہ کھانا رکھنے لگی تو لال خان بولے' ہم تو بھول گئے تھے۔ آج شام کالے خان بھائی نے کھانے پہ بلایا ہے۔ آپ لوگ تیار ہونے میں دیر کریں گے ہم ہو آتے ہیں۔ چلے گئے۔ وہاں سے رات گئے لوٹے۔ آتے ہی لیٹ گئے۔ بولے طبیعت سست ہو رہی ہے۔ مسجد میں عشاء کے فرض مشکل سے پڑھے۔ بیٹھ کے باقی نماز مکمل کی۔

سر میں چکر سا آ رہا ہے۔
ذرا ارجمند کو بلایئے۔

سر دبا دے۔
ابھی ارجمند بانو پہنچی بھی نہ تھی کہ ایک دم سے اٹھے' بولے پیٹ میں کھلبلی سی مچی ہے۔ ذرا ہم اوپر ہو آؤں۔ وہ سیڑھیاں اوپر چڑھ گئے۔ چاند بیگم لوٹا پانی کا لے کر

اجابت خانے کے باہر کھڑی رہیں۔ اوپر سے نیچے آنا انہیں محال ہو گیا۔ سیڑھیاں نہ ہوئیں پہاڑ ہو گیا ان کے لیے۔

چاند بیگم بولی۔ باقر کو بھیج کے حکیم صاحب کو بلاتی ہوں۔

رہنے دیجیے، پیٹ میں کھلبلی تھی، تھم گئی۔ رات کا وقت ہے، حکیم صاحب بوڑھے ہیں، نظر ان کی کم ہے۔ کیوں انہیں زحمت دیتی ہیں۔ اب سوتے ہیں، صبح شوق سے حکیم صاحب سے صلاح کر لیجیے گا۔ لیٹ گئے۔

دہلی کے بادشاہوں کی کہانی کہاں تک سنی تھی، بیٹی بانو۔

آج اورنگ زیب بادشاہ کی باری ہے ابا۔

کہانی تو لمبی ہے بیٹی بانو۔

آج ہماری طبیعت ست ہے۔

چار بھائی تھے وہ۔ باپ ان کا بیمار ہو گیا۔ شاہ جہان بادشاہ۔ مر جاتا تو اچھا تھا۔ بیمار ہو کے اچھا ہو گیا۔ خبر پھیل گئی مر گیا ہے یا مرنے والا ہے۔ تین شہزادے ملک کے دور کونوں میں تھے۔ شجاع بنگال میں، مراد گجرات میں اور اورنگ زیب دکن میں۔ صرف دار اشکوہ بادشاہ کے پاس تھا۔ اسے لاہور اور ملتان کا صوبہ دیا تھا مگر وہ گیا نہیں۔ باپ کی فوج کو ہاتھ میں رکھنے کے لیے باپ کے سر پہ بیٹھا رہا۔

پھر کیا ہوا ابا؟

بیٹا پھر کیا ہونا تھا۔ شہزادے مرنے مارنے پر تل گئے۔

شاہ کی فوجیں بٹ گئیں۔

بیمار باپ تماشہ دیکھتا رہا۔

اب ہمیں سونے دیں۔ دل میں خنکی سی ہو رہی ہے۔

ابا میں آپ کے پاؤں سہلاتی ہوں۔ آپ کہانی کہیں۔

کہانی کیا کہنی ہے بیٹا۔ بھائیوں کے ہاتھوں بھائی مرتے گئے۔ کوئی تلوار سے

گرا، کوئی زہر سے مارا گیا۔ کسی کو دشمن بنا کے مارا۔ کسی کو دوستی میں ساتھ ملا کے گرایا گیا۔ سارے بھائی مر گئے۔ ایک بچ گیا۔ اس نے باپ کو قید کر لیا خود بادشاہ بن گیا۔ بس یہی ہماری دہلی کی آخری شاہی کہانی ہے کہ ایسی کہانی کے بعد پھر کسی بڑی عالیشان کہانی کی گنجائش نہیں رہی۔

اب ہمیں نہ ستانا۔ ہماری آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ لال خان سو گئے۔ اگلی صبح دیر تک لال خان بستر سے نہ نکلے تو چاند بیگم جگانے گئی۔ دیکھا تو وہ مردہ پڑے ہیں۔ چہرہ نیلا ہوا ہے۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہیں۔

ایکا ایکی کہرام مچ گئی۔

سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔

کالے خان اور انکی بیگم ساحرہ بھی بھاگی آئیں۔

سب لوگ سر پیٹ کے بیٹھ گئے۔ ہائے اچھے بھلے رات کو باتیں کرتے ہمارے پاس سے گئے تھے بڑے بھیا۔ اجی یہ کیا غضب ہو گیا۔ عشاء کی نماز میں ہمارے پہلو میں کھڑے تھے۔ وہ تو جب انہوں نے سنتیں بیٹھ کے پڑھیں تو بھی ہم نہ چونکے۔ ہم سمجھے نفل پڑھ رہے ہیں۔ ہمیں کیا پتہ تھا وہ انکی آخری نماز تھی۔ ہائے ہمیں دیکھیں ہمیں تو انہوں نے بیٹوں سے بڑھ کے رکھا۔ کہنے کو ہمارے بھیا تھے مگر بھیا تو ہمارے باپ سے بڑھ کے رہے۔ ہم تو یتیم ہو گئے۔ ہوا کیا بھابھی ہمارے بھیا کو بتایئے تو سہی۔

ہم تو لوٹا لے کے ان کے پیچھے اوپر تک گئیں، اندر بیٹھے بیٹھے انہوں نے ہاتھ بڑھا کے مانگ لیا لوٹا۔ ورنہ ہم تو صبح تک کھڑی رہتیں۔ ہائے کیا ہو گیا ہمارے سرتاج کو ہم تو لٹ گئے۔ چاند بیگم نے سر پر دو ہتڑ مار کے اپنا سر کھول لیا۔ رات کو خدا جانے کیا کھا کے آئے کالے خان آپ کے گھر سے' آتے ہی طبیعت سست ہو گئی۔ ایک دو بار قے ہوتے ہوتے رہی۔ ہم سے پان مانگا۔ ہم نے گلوری لگا کے دی۔ کھا کے لیٹ

گئے۔

حکیم صاحب! دیکھئے تو سہی' رات اچھے بھلے سوئے تھے۔

چاند بیگم سسکیاں لے رہی تھی۔

حکیم نے نبض پر ہاتھ رکھا۔ ماتھے کو چھوا۔ سینے پہ کان رکھا اور پھر نفی میں سر ہلا کے انا اللہ وانا علیہ راجعون منہ میں پڑھتے ہوئے اوپر آسمان کی طرف ایک انگلی کر کے چپکے سے کمرے سے نکل گئے۔ باہر صحن میں ایک کونے میں جا کر سر جھکا کے بیٹھ گئے۔

کمرے میں پھر زوروں سے آہ وزاری ہونے لگی۔

ارجمند بانو کا رنگ پیلا ہو گیا۔

ہاتھ پاؤں سے جیسے جان نکل گئی۔ اس کے چھوٹے بھائیوں کو سمجھ نہ آئے ہوا کیا۔ وہ اپنے بھائیوں سے لپٹی ہوئی زمین پہ گری' بال کھولے گریہ زاری کرتی رہی۔ چاند بیگم اپنے میاں کے پاس فرش پہ بیٹھ گئی اور لال خان کے چہرے' ماتھے اور گردن پہ ہاتھ پھیرتی خون کے آنسو روتی رہی۔ وہ روتے روتے کبھی لال خان کے ہاتھوں کو کھول کے ان میں اپنا ماتھا رگڑتی پھر پاگلوں کی طرح اس کے بازوؤں کو چومتی جاتی۔ وہ اپنے ہوش وحواس کھوئے بیٹھی تھی۔

انہیں سنبھالیے۔ کوئی کہتا

غم ہی ایسا ہے کیا کریں' چاند بیگم بھی بیٹھے بٹھائے بیوہ ہو گئیں۔

پہلے بیٹی کا غم تھا اب خود بے آسرا ہو گئیں۔ کیسے سنبھالیں انہیں۔

تھوڑے تھوڑے وقفے بعد کسی نہ کسی پڑوسن کے کسی ایسے جملے سے پھر کہرام مچ جاتا۔ وہ دن ایسے کیسے گزرا' شام تک لال خان کو کفنا کے دفنا دیا گیا۔ اگلے دن کالے خان کی طرف سے ان کے لیے کھانا آیا۔ کسی نے نہ کھایا۔ سب بھوکے پڑے رہے۔ ارجمند بانو چھت دیکھتی رہی۔ ویران باپ کے کمرے میں دیوار سے ٹیک لگائے چھوٹے دونوں بھائی باقر اور اکرم ارجمند بانو کی بغلوں میں سر دیئے بیٹھے سسکتے

رہے۔ چاند بیگم باہر آسمان کے نیچے صحن میں ڈھیر ہوئی کمرے کی دہلیز کو اپنے داہنے پاؤں کے انگوٹھے سے چھوتی رہی۔

دوسرا دن چڑھا۔

اڑوس پڑوس والے پھر آ گئے۔

لوگوں کے کہنے سننے پہ چھوٹے بھائیوں کو ارجمند بانو نے دو چار لقمے کھلا دیے۔

کالے خان کے گھر سے آئے کھانے پہ مکھیاں بھنبھناتی رہیں۔

تیسرے دن لوگ پرسا دینے پھر آ گئے۔

ان لوگوں میں بوڑھے حکیم صاحب بھی سوٹی ٹیکتے، ٹک ٹک کرتے آ گئے۔ سر سے لٹھے کی دھلی ہوئی دوپلی ٹوپی کھینچ کے درست کی اور ارجمند بانو کی تسلیم کے جواب میں اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے "جیتی رہو" کہہ کے آہستگی سے بولے ذرا اپنی اماں کو ادھر بلایئے۔

ارجمند بانو حکیم صاحب کے منہ سے سرگوشی کے انداز میں کہی اس بات کو سن کر پاؤں تک لرز گئی۔ ایک دم سے اسے خیال آیا کہ حکیم صاحب یقیناً کوئی بے حد اہم بات کہنے والے ہیں، اماں سے۔ اسی لیے وہ حکیم صاحب کے لیے بیٹھنے کو موڑھا آگے سرکاتی ہوئی اسی طرح سرگوشی کے انداز میں پوچھنے لگی۔

کوئی خاص بات ہے تایا جی؟

حکیم صاحب کو اس محلے میں زیادہ تر بچے بچیاں تایا جی کہہ کے بلایا کرتے تھے۔

جی بیٹا۔

بات تو اہم ہی ہے۔

ابا کے بارے میں بات ہے کوئی۔ ارجمند بانو نے اسی طرح آہستگی سے پوچھا۔

ہاں بیٹا آپ کو کیسے علم ہوا۔ حکیم صاحب نے پوچھا۔

ان کی موت کے بارے کچھ کہنا ہے آپ کو۔ ارجمند بانو نے ان کے کان میں لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

حکیم صاحب چونک گئے۔ بولے آپ کو علم ہے کیا؟

میرا من کہتا ہے تایا جی۔

بیٹا ہم من کی نہیں عقل کی بات کہنے آئے ہیں۔ آپ اپنی اماں کو بلایئے پھر ہم بتاتے ہیں۔ ارجمند بانو اپنی ماں کو کندھوں سے پکڑ کے لے گئی۔ چاند بیگم اجڑی ہوئی کیاری کی طرح حکیم صاحب کے سامنے جا کے بیٹھ گئی اور ایک دم سے سر دیوار سے دیوانوں کی طرح رگڑ رگڑ کے بال بکھرا لیے۔ چہرہ آنسوؤں سے بھر گیا۔ آواز رندھ گئی۔ رندھی آواز میں چاند بیگم بولی۔

ہائے قسمت،

ہم، آپ کو بلوا لیتی تو شاید وہ بچ جاتے۔ ہم نے تو بہتیرا کہا، انہی نے منع کر دیا تھا۔ ہمارے نصیب مرے تھے۔ منع کرتے رہتے۔ باقر کو بھیج کے آپ کو بلوا لیتی تو شاید خدا ہمارے سر پہ آسمان نہ گراتا۔ ہم تو دھوپ میں آ گئے حکیم صاحب۔

جب تک آس پاس کچھ پڑوس کے لوگ بیٹھے رہے حکیم صاحب کچھ نہ بولے۔ جونہی گھر میں لوگوں کی بھیڑ کم ہوئی انہوں نے پاس بیٹھی چاند بیگم کا کاندھا پکڑ کے پوچھا،

بیگم صاحب یہ بتایئے جب رات لال خان گھر آئے تو ان کی کیا کیفیت تھی؟

چاند بیگم ان کی بات کا رخ نہ سمجھی۔

پوری کہانی سنانے لگی۔

انہوں نے قے کی یا متلی ہوئی انہیں؟

متلی کا بار بار کہتے تھے قے نہ ہوئی۔

پھر پیٹ میں کھلبلی ہوئی تو چھت پہ بھاگے، میں لوٹا لیے پیچھے پیچھے گئی۔

کچھ پتہ ہے پاخانہ انہیں کس رنگ کا آیا؟ صبح مہتری سے پوچھا ہوتا۔
ہمیں کہاں ہوش تھی حکیم صاحب، پوچھنے کی، یہ کہہ کے پہلی بار چاند بیگم نے معنی خیز نظروں سے سر اٹھا کے حکیم صاحب کا چہرہ دیکھا۔
پاس کھڑی ارجمند بانو یہ بات سن کے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ پھر ہولے ہولے کہنے لگی۔
مجھے مہتری نے خود بتایا تھا کہ اگلے دن۔ وہ اوپر صفائی کے لیے گئی تو وہاں کالے ہرے رنگ کا پاخانہ تھا۔ وہ تو کہہ رہی تھی جیسے اس میں خون بھی ملا ہوا ہو۔ ابا کے بعد تو کوئی بھی اس رات چھت پہ نہیں گیا۔
پھر؟
انہی کا پاخانہ تھا وہ۔
ان کا پیٹ اندر سے کٹ گیا تھا۔ جگر سے خون نکل کے معدے میں آیا تھا۔
ہمارا انداز صحیح نکلا۔ حکیم صاحب نے جیسے کچھ سمجھ کے سر اثبات میں ہلایا۔
آپ کیا کہہ رہے ہیں ہم کچھ نہیں سمجھے حکیم صاحب۔ چاند بیگم ایک دم بے چین ہو گئیں۔
بہن جی۔ آپ ہماری بیٹی سمان ہیں۔ لال خان ہمیں بھائیوں کی طرح عزیز تھے۔ انہیں اس صبح بستر پر مردہ دیکھتے ہی ہمارے من میں کئی سوال ابھرے تھے۔ ان کے ہونٹوں کی سیاہی' چہرے کا نیلا پن' آنکھوں کا یوں بجھا ہوا ہونا۔ جیسے پھونک مار کے چراغ گل کیا ہو۔ ہمیں سب نظر آ گیا تھا۔ مگر زبان کھولنے سے پہلے ہم نے غسال سے بات کی۔ پتہ چلا کہ جب انہیں غسل دیا گیا تو ان کے جسم سے نیلاہٹ بھرا سیال نکلا تھا۔ وہ بھر بھر کے صاف اجلے مشک ملے پانی کے ڈونگے ان پر گراتے تھے اور ان کی جلد کے مسام اور جسم کے پیندے سے چھو چھو کے پانی میں نیلاہٹ آتی تھی۔ اگرچہ وہ اتنی معمولی تھی کہ زیادہ لوگوں نے اس پہ غور نہیں کیا۔ ویسے بھی غسال کے

ساتھ اس وقت کالے خان کے علاوہ اور کون تھا۔ انہی کا کوئی آدمی ہوگا۔

غسال بہرحال پرانا آدمی تھا۔

اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ دریافت کرتا۔ خود کل شام اسی نے مجھ سے تذکرہ کردیا۔ مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔ تب یقین ہوگیا۔

آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ قبلہ حکیم صاحب چاند بیگم دیوانوں کی طرح بیٹھی تھی ہاتھوں کو زمین پہ رکھ کے آدھی زمین سے اٹھ گئی۔

آپ کا مطلب ہے......؟

ہم نے تو امام صاحب سے بھی تصدیق کرلی۔ کفن کے نیچے جو سفید پارچہ امام صاحب کے نماز جنازہ کے لیے ہوتا ہے۔ اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اس پہ ہمیں واضح نیلگوں زہر کے نشان نظر آگئے۔ تب شک کی گنجائش ہی نہ رہی۔ انہیں زہر دیا گیا تھا۔

ہائے کچھ نہ بچے ساحرہ بیگم۔ تو نے ہمارا گھر اجاڑ دیا۔ ہمیں یہی دھڑکا لگا تھا۔ ہو نہ ہو یہ شریکوں کا کیا کام ہے۔ ہائے ہمارا ہیرے جیسا میاں انہوں نے چٹکیوں سے مسل دیا۔ ان بے ایمانوں کی خاطر اس نیک دل انسان نے کیا نہیں کیا۔ خود دن رات محنت کرتے اور اس آوارہ اور بدقماش بھائی کو جنہیں کبوتروں سے ہی فرصت نہیں، ان کے گھر کو بھی پالتے۔ اپنے خون پسینے سے کمائے' بنائے کارخانے میں انہیں مفت میں حصہ دے دیا۔ گھر میں جب بھی کوئی نئی چیز بنتی ہمیں کہتے کالے خان کو بھجوائی۔ ہم ان کے کہنے سے پہلے ہی رکابی بھر کے باقر کے ہاتھ ادھر بھجوا دیتے۔ ہائے ہائے، ظالم اپنا بھائی مار دیا۔ یہ ان دونوں میاں بیوی نے مل کے سازش کی ہوگی حکیم صاحب۔ معاف نہیں کریں گے ہم انہیں حکیم صاحب۔ کچہری میں انہیں کھینچوں گی۔ کوتوال کے پاس جاتی ہوں۔ پھانسی دلاؤں گی۔

آپ ذرا دھیرج رکھ کے ہماری بات سنیے۔ حکیم صاحب نے بے حد آہستگی

سے کہا۔

کوتوال کچہری کا موقع نہیں ہے۔ ہم کیسے یہ ثابت کریں گے کہ زہر انہوں نے دیا۔

انہی کے گھر سے شام کا کھانا کھا کے وہ آئے تھے۔ آتے ہی لیٹ گئے۔

وہ تو ٹھیک ہے ہمیں تو معلوم ہے ساری حقیقت۔ لیکن اگر ہم نے یہ بات چھیڑی تو وہ وکیلوں سے مل کے خدا جانے اس بات کا کیا بتنگڑ بنا دیں۔

اور بتنگڑ کیا بننا ہے۔ حکیم صاحب ان کا زہر دینا ثابت ہے۔ آپ کا بیان عدالت میں کافی ہے۔ مہترانی نے جو دیکھا وہ جا کے کہہ سکتی ہے۔ پھر بھلا کیسے یقین نہیں آئے کہ انہیں زہر دیا گیا تھا۔ چاند بیگم کہتی ہے۔

وہ تو بیگم صاحبہ' چلیں مان لیتے ہیں کہ فرنگی جج یہ تسلیم کر لے کہ انہیں زہر دیا گیا ہے۔ مگر یہ کون طے کرے گا کہ کس نے دیا۔

یہی تو ہم کہہ رہے ہیں اور کس نے دینا ہے کالے خان اور اس کی جورو ساحرہ بیگم نے اور اس کس نے حکیم صاحب۔

بیگم صاحبہ' آپ کالے خان کو نہیں جانتی' وہ بڑی آسانی سے سارا مدعا آپ پہ ڈال سکتا ہے۔ ارجمند بانو پہ ڈال دے گا۔ آپ کے کسی گھر کے فرد پہ سارا الزام دھر کے خود مظلوم بن کے عدالت میں فریادی بن بیٹھے گا۔ ہم اس بدفطرت انسان کو جانتے ہیں۔ آپ نہیں جانتے۔ ہم ان عدالتوں کے وکیلوں کو جانتے ہیں' انہوں نے یہی ایک نکتہ اٹھانا ہے کہ لال خان کے گھر والی' کالے خان کے گھر کی کسی دعوت کی منتظر تھی۔ جونہی ایک بار ادھر سے ان کا میاں کھانا کھا کے آیا' انہوں نے پان میں زہر دے کے اپنے میاں کو مار دیا تاکہ الزام کالے خان پہ پڑے۔ ایک بھائی مر گیا دوسرا پھانسی پہ چڑھ جائے سارے کارخانے پہ ان کا راج رہ جائے۔ وہ جتنا کمینہ اور رذیل ہے آپ اس سے واقف نہیں۔ ہم جانتے ہیں۔

ہیں۔ چاند بیگم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔
آپ کیا کہہ رہے ہیں حکیم صاحب؟
حقیقت بول رہا ہوں، بیگم صاحبہ۔
اب کیا کریں۔ حکیم صاحب ہم تو لٹ گئے۔
جس ظالم نے ہمارا گھر اجاڑا اسے یونہی کھلا چھوڑ رکھیں۔
کیا کر سکتے ہیں بیگم صاحبہ اللہ کی رسی پہ نظر رکھیں۔ اللہ ہی اس ظالم کو غارت کرے گا۔ بہت برا انجام ہوگا ایسے شخص کا۔ آپ دیکھ لیں۔ ہمیں تو آپ کی اور آپ کے بچوں کی فکر ہے اب۔ آپ چوکس رہیے گا۔ کہیں وہ رذیل پھر وار نہ کر دے۔
حکیم صاحب ہم تو زندہ درگور ہو گئے۔ ہمارے پاس اب بچا ہی کیا ہے ہمیں ایک بار کوتوالی جانے دیجئے۔ ہم ان ظالموں کی گردن کھنچی دیکھنا چاہتے ہیں۔ خدا انہیں کہیں امان نہ دے گا۔
جیسے آپ کی مرضی۔ ہم بوڑھے ہیں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ سوٹی ٹیک کے چلتے ہیں۔ جہاں آپ کہیں گی ہم آپ کے ساتھ چلیں گے۔ لیکن ہم ٹھہرے بوڑھے کمزور۔ آپ عورت ذات ہیں۔ بیٹے آپ کے دونوں کم سن ہیں۔ بیٹی اور نواسی کی الگ آپ پہ ذمہ داری ہے۔ آپ ان بدقماشوں سے کیسے کچہری میں مقدمہ لڑیں گی۔ آپ سوچ سمجھ کے قدم اٹھایئے گا۔ جو بھی اٹھائیں۔ میری مانیں تو ابھی اس پاجی پہ یہ بھید نہ کھلنے دیجئے گا کہ آپ کو علم ہو چکا ہے۔ ان کے گناہ کا۔ دیکھئے ابھی اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ ان کے گھر کے آٹے اناج کو ہاتھ نہ لگایئے گا۔ اب اجازت چاہتا ہوں ہم سے کوئی صلاح کرنی ہو تو برخوردار کو بھیج کے بلوا لیجیے گا۔
حکیم صاحب چلے گئے۔
چاند بیگم اور ارجمند بانو سر پکڑ کے بیٹھ گئیں۔
ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جگہ شعلے آ گئے۔ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے

سے چمٹ کے سسکنے لرزنے لگیں۔ دونوں بیٹے سہمے ہوئے ان سے آ کر چپک گئے۔
کچھ دن ایسے گزر گئے۔

ایک دن کالے خان آ گیا۔

ٹھگنا سا کالا بھدا آدمی تھا۔ مونچھیں بڑھا رکھی تھیں۔ موٹا ناک اور کلّے چوڑے تھے۔ داڑھی باریک کترتا تھا۔ کالے گالوں پہ چھوٹے چھوٹے بال ایسے اگے ہوئے تھے جیسے مکھیاں بیٹھی ہوئی ہو۔ منہ میں پان رکھے جبڑے گھما گھما کر چباتا رہتا۔ کلف لگا اکڑا اکڑ کرتا انگرکھا' نیچے ترچھا گرچھا چست پاجامہ' اور ٹیڑھی رکھی دو پلی لٹھے کی ٹوپی پہنے ایک دم سے بنا دستک دیئے گھر کے اندر آ کے کھڑا ہو گیا اور انتہائی مکاری سے ہاتھ ٹوپی کی کنی کو لگا کے بولا۔

آداب عرض ہیں۔

چاند بیگم نے زہر بھری نظروں سے اسے دیکھا اور اس کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر تک وہ صحن میں ادھر ادھر گردن گھما کے دیکھتا رہا' پھر بولا'

بیٹھنے کو نہیں کہیئے گا بھابی حضور۔

چاند بیگم سے ضبط نہ ہو سکا۔ ایک دم چلا کے بولی' ہمارا گھر تباہ کر دیا'

اپنے ہی بھائی کو زہر دے کر مار دیا ظالم'

اب یہاں تمہارے لیے تخت پوش بچھواؤں۔

بے حیا

تمہیں بچوں کی طرح پالا تم ہی نے انہیں مار دیا۔

اپنی ڈائن بیگم سے مل کے۔

تجھے تو پھانسی دلواؤں گی۔ تمہیں بھی اور تمہاری جورو کو بھی۔

پناہ نہ ملے گی دونوں جہانوں میں تم دونوں کو۔

کالے خان یہ صلواتیں سن کر زیر لب مسکرایا۔

قریب ہی پڑے ہوئے ایک موڑھے کو پیر سے اپنی طرف کھینچ کے بے دھڑک ہو کے بیٹھ گیا اور پان چباتے چباتے بڑی زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا'
ناحق آپ خون جلا رہی ہیں بھابھی۔
انہیں زہر دیے جانے کا شک تو ہمیں بھی تھا حکیم صاحب سے ہی ہم نے تصدیق کرائی تھی۔ مگر ہم نے سوچا کہ اس عمر میں رنڈی بیٹی۔ کم عمر نواسی اور نوعمر بیٹوں کے ساتھ آپ کہاں کوتوال کچہری میں کھنچی پھریں گی۔ پان میں زہر دے کر تو آپ نے ہی انہیں چلتا کیا۔ اب الزام ہم پہ دھر رہی ہیں۔ واللہ
نکل جاؤ ہمارے گھر سے شیطان کی اولاد۔ ہم آپ کی شکل دیکھنا نہیں چاہتے۔ چاند بیگم چلا کے بولی۔
دھیرج رکھیے بھابھی محترمہ۔
یہ گھر آپ کا ہوتا تو شاید آپ ہمیں نکلوا ہی دیتی یہاں سے۔
کیا کریں، بھیا مرحوم ہمیں اتنا پیار کرتے تھے کہ سارا کارخانہ ہمارے نام کر دیا۔ کارخانے کے لیے بنگال اور پنجاب کا مال ادھار پر لیتے رہے' دیتے رہے۔ ہم نے تو کئی بار منع بھی کیا۔ نہ مانے۔ لوگوں کے تقاضے ہوتے۔ ایک دن یہ گھر بھی لالہ جنسی رام سے پیسے نقد لے کر گروی رکھ دیا۔ وہ تو ہم نے ابھی کل ہی لالہ کے پیسے ادا کر کے گروی کے کاغذ ان سے لے لیے کہ اس عمر میں ہماری بھاوج اور ان کی خوبرو رنڈی بیٹی، کم عمر بیٹے، کہاں دھکے کھائیں گے۔ آپ اطمینان سے یہاں رہیے ہم آپ کو نکالنے کی کیوں زحمت کریں گے' ہاں جو ہو سکے آپ اور آپ کے بچے کارخانے میں مزدوری کر کے چار پیسے کمائیں اور بھی تو کماتے ہیں ادھر سے۔ ہم تو آپ سے مکان کا کرایہ بھی نہیں مانگتے۔ نہ آپ سے مانگ کے پان ہی کھائیں گے۔ کیا پتہ بھیا کو دیئے زہر سے آپ ہمیں بھی چلتا کریں۔ چلتا ہوں۔ تسلیم۔
چاند بیگم اور ارجمند بانو کے لیے پہلے صرف آسمان گرا تھا اب زمین بھی پھٹ

گئی۔ لال خان کو مرے مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے چند چیزوں کی گٹھڑیاں باندھیں اور اس گھر سے نکل گئیں۔

کہاں جائیں۔

چاند بیگم لال قلعے کے سامنے آ کر بیٹھی سسکنے لگی۔

لال خان تم تو کہتے تھے تم پچھلے جنم میں لال قلعہ تھے۔

اب یہ بتاؤ اگلے جنم میں تم کیا ہو گے۔

یہ لال قلعہ تو ہمارا تماشہ نسلوں سے دیکھتا آیا ہے۔ پہلے پتہ نہیں یہ دہلی کیسے اجڑا تھا۔ اجڑا تو یہ اب ہے ہمارے لیے۔ ہمارا کچھ نہیں بچا یہاں۔ ہم کدھر جائیں۔ لال خان میں تیرے باپ دادا اور ان کے باپ دادا کی روحوں سے پوچھتی ہوں کہ ان کے گھروں میں لال خان اور ارجمند کے ساتھ کالے من والے پاجی کیوں پیدا ہوتے رہے۔

لال خان میں کدھر جاؤں۔

تیرے کم سن بیٹوں جوان بیٹی اور چند سال کی نواسی کو لے کر۔

سارا شہر، سارا دہلی میرے لیے ڈھہ گیا آج۔

دیکھ ارجمند بیٹی۔

ہم کبھی پہلے "ہم" سے کم بات نہیں کرتے تھے آج ہم "میں" بھی نہیں رہے۔ کچھ بھی نہیں رہے۔ ہم گلی کا کوڑا ہو گئے۔ اچھا، اے دہلی کے خدا، اے لال قلعے کی چھت والے میرے اللہ جس ظالم نے ہمارا گھر تباہ کیا ہے ہم بے گناہوں کو اس طرح ذلیل کیا ہے ہمارے سر کا جس نے آسرا چھینا ہے۔ ہمارے گھر بار کو جس نے لوٹا ہے۔ اسے معاف نہ کرنا۔ میں کمزور نحیف عورت اپنا مقدمہ تیرے روبرو پیش کرتی ہوں۔

تو سچ کو جانتا ہے۔

تو اس سے بھی نا آشنا نہیں جو ہمارے دلوں میں ہے۔ اس لیے کہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ ہم سے قریب تر ہے۔

میرے اللہ ہم حق پر ہوتے ہوئے بھی ہار گئے۔

اب ہماری جنگ تو لڑ۔

میں تو کمزور ہوں۔

تم تو کمزور نہیں۔

مجھ پہ ظالم غالب آ گئے ہیں۔

تجھ پر کوئی غلبہ نہیں پا سکتا۔

تو سب پہ غالب آنے والا ہے۔

تیرا مقام عالی شان۔

تیری قوت سب سے یکتا۔

سب پہ تو بھاری ہے۔

سب کا تو بنانے والا ہے۔

سب کو فنا کرنے والا ہے۔

تو سن رہا ہے نا۔

ہاں تو سنتا ہے۔ دیکھتا ہے۔

اور کوئی نہیں ہے جو تجھے روک سکے۔

میں تیرے سامنے دہائی دیتی ہوں۔

دہائی دیتی ہوں۔

دہائی دیتی ہوں۔

چاند بیگم رو رو کے ہلکان ہو گئی۔ رونے سے دل ہلکا ہوا تو ارجمند بانو سے پوچھنے لگی بیٹی اب کدھر چلیں۔ ارجمند بانو یہ سن کر رونے لگی۔

نہ رو جتنا رونا تھا رولیا۔

اب چل اس منحوس شہر سے نکل چلیں۔

یہاں تیرے باپ دادا اوران کے دادا نہیں بچے۔ ہم بھی نہیں بچیں گے، اگر ٹھہرے رہے۔ چاند بیگم کافی دیر خاموش بیٹھی رہی۔ پھر بولی میرے پاس کچھ عرصے کے لیے زادراہ ہے۔ جو چار چوڑیاں' ہار گہنے آپ کے باپ نے ہمیں دیئے تھے۔ وہ ہیں ہمارے پاس۔ ہماری پانچ بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ سودیش پور ہمارے بھائی کا گھر ہے۔ لکھنو، بریلی، رام پور، امروہہ اور علی گڑھ ہماری بہنیں بیاہی ہیں۔ مگر ہم ان میں سے کسی کے پاس نہیں جائیں گے۔

لٹے پٹے لوگوں کا کوئی رشتے دار نہیں ہوتا۔

ان کے ہنستے بستے گھرانوں کو ہم اپنی بدنصیبی کا کیوں گرہن لگائیں۔ وہ ہمارے نصیب سے لڑیں گے کیا۔ پتہ نہیں ان سے آ کر لڑ پڑیں۔ یہ بھی ممکن ہے۔ یہ ظالم ادھر تک ہمارا پیچھا کریں۔ پھر کیا پتہ کسی کے دل کا، کون اپنا ہے، کون نہیں ہے۔ سارے اعتبار جاتے رہے۔ جب ہمارے ہاتھوں پل کے بھی ہمارا اتنا سگا ہمارا نہ ہوا۔ پھر کیا رشتے ناتوں کی کشتی میں سوار رہنا۔

اب ہمارا کوئی نہیں ہے۔

کوئی ہے تو آپ کے باپ کی یاد ہے' ان کے دوست ہیں۔ ہمارا رب ہے۔

ہمیں یاد آتا ہے بنگال اور پنجاب میں کئی ساہوکاروں نے آپ کے باپ کے پیسے دینے ہیں۔ بنگال تو دور ہے۔ پنجاب کے شہر لدھیانہ میں ایک شخص چوہدری غلام محمد ہے۔ آپ کے ابا نے ایک دو بار ان کا ذکر کیا تھا۔ ان سے لین دین چلتا تھا کپڑے کے یہ کوئی بیوپاری ہیں۔ آپ کے ابا کا ان کی طرف سوا سات ہزار روپیہ نکلتا ہے۔ کیا پتہ مل جائیں پیسے دے دیں۔ اس کا پتہ تو ہمارے پاس نہیں ہے۔ مگر سنا ہے لدھیانہ دہلی جتنا بڑا شہر نہیں۔ اللہ نے مدد کی تو ہم انہیں ڈھونڈ لیں گے۔ یہاں دہلی

سے کئی سالوں سے ٹھپائی کروا کے تھان لے کر جاتا رہا ہے وہ۔ آپ کا باپ بھی جس طرح اس کا ذکر کرتا تھا اس سے لگتا ہے کہ وہ کم ظرف آدمی نہیں ہوگا۔ چل اٹھ ہماری بیٹی۔ ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے والا یکہ لے۔

چل، چل کے ہم لدھیانہ کے ٹکٹ لیتے ہیں۔

تانگہ لال قلعہ سے نکل کے جامع مسجد کی سیڑھیوں کے آگے سے گزرتا ہوا چاندنی چوک سے گزرا۔ آگے چل کے ایک طرف کوکشمیری دروازہ رہ گیا۔ دوسری طرف سبزی منڈی کے پاس شمال کی سمت کو انڈیا گیٹ بنا ہوا نظر آیا۔ وہ پینتالیس گز اونچا دروازہ تھا۔ جس پہ چاروں طرف مچانیں لگی تھیں اور مستری اوپر چڑھے لکھے ہوئے ہزار ہا ناموں کی تختیاں اس پر آویزاں کرتے جا رہے تھے۔ ارجمند بانو نے وہ دروازہ دیکھ کے اپنی ماں سے کہا۔

ماں ذرا یکے والے سے کہوں ادھر سے ہو لے۔

کیوں؟ ماں بولی۔

ماں ابا کہتے تھے اس دروازے پر انگریز سرکار ان پچاس ہزار سپاہیوں کے نام لکھوا رہی ہے جو افغان جنگ اور پہلی جنگ عظیم میں مرے تھے۔ شاید ان میں دلارے میاں کا بھی نام ہو؟

نہیں بیٹی رہنے دو۔ ایسی تختیوں میں زہر باد اور زہر سے مرنے والے شہیدوں کے نام نہیں ہوا کرتے۔

اب بھی کہیں رک کے نہ دیکھنا۔ یہ طلسماتی شہر ہے۔ یہاں مڑ کے دیکھنے والوں کی روحیں لال قلعوں، میناروں اور حویلیوں میں ٹنگی رہ جاتی ہیں اور وہ خود بنا روح کے جسم لیے راستوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ چل بیٹی۔ سیدھا دیکھ۔ وقت کی آنکھ میں آنکھ ڈال کے دیکھ اور یاد رکھ وقت سے بڑا پہلوان کوئی نہیں ہے۔ یہ وہ پہلوان ہے جو کسی سے چت نہیں ہوتا۔ اگر کوئی اسے چت کرتا ہے تو وہ بھی وقت ہی ہوتا ہے، جسے

ابھی آنا ہوتا ہے تو آنے والے وقت کا اسی امید میں انتظار کر خوف نہ کر، ہر دکھ بھری کالی رات اپنی کوکھ سے ایسی پہلوان صبح کو پیدا کرتی ہے، جو گزرے ہوئے سارے اندھیروں کو بھگا دیتی ہے۔ لکھے گئے روشن نصیب جگا دیتی ہے۔ بس میری بیٹی، جاگتی رہ۔ جن حادثوں کو ہونا تھا، وہ ہو گئے۔

□

پہلوان

اس دن اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ آج کوئی حادثہ ہوگا۔ کوئی بڑا حادثہ۔ کسی نہ کسی کی جان اس کے ہاتھ سے جائے گی۔ وہ عجیب طرح سے سہا ہوا تھا۔ خون اس کی کنپٹی میں سانپ کی طرح پھنکارے مار رہا تھا۔ چہرہ لال بھبوکا ہوا ہوا تھا۔ رنگ کا وہ گورا چٹا تھا۔ خون کا دباؤ سر کی طرف ہوا تو چھلی ہوئی گاجر کی طرح چمکنے لگا۔

سترہ بھائیوں کا وہ اٹھارواں بھائی تھا۔

عمر اس کی انیس بیس سال تھی۔

نام تھارا نجھا۔

جب سے اس نے ہوش سنبھالی تھی ایک ہی کام سیکھا تھا۔ پہلوانی۔

صبح پو پھٹنے سے پہلے وہ سر پہ پٹکا لپیٹ' کندھے پہ تولیہ رکھ' لنگوٹ کس کے تہمد باندھ کے نکل جاتا۔ لدھیانہ شہر کے عین بیچ میں چوڑے بازار کی بغل میں اس کا سارا کنبہ رہتا تھا۔ ایک بڑی حویلی تھی اس کے خاندان کی۔ پیلے رنگ کی تین منزلہ۔ انتیس کمرے تھے حویلی میں۔ آگے حویلی کے ایک کھلا احاطہ تھا جس میں اس کے قبیلے کے لوگوں کی بھینسیں بندھی ہوتی تھیں۔ احاطے کی بھینسیں اور حویلی کے سارے کمرے اس کے دادا کی اولاد میں تقسیم ہوئے تھے۔

وہ اپنے دادا سے بڑا سخت ناراض تھا۔ حالانکہ اس کی ولادت دادا کی وفات کے کئی سال بعد ہوئی تھی۔ اس نے اپنے دادا کے بہت قصے اور کہانیاں سن رکھی تھیں۔ اس کے دادا کا نام نواب دین تھا۔ رانجھے نے سن رکھا تھا کہ دادا اس کا بڑا وجیہہ آدمی تھا۔ مجلسی طبیعت تھی اس کی۔ علاقے میں چوہدراہٹ تھی۔ تانبے کے نقش نگار بھرے گھومنے والے نیچے کے حقے کی نے منہ میں دیئے وہ حویلی کے کھلے احاطے میں روز شام کو دوستوں کی منڈلی میں بیٹھتا تھا۔ یہ حویلی اس نے تن تنہا اپنی جوانی میں یہاں آ کے خریدی تھی۔ تھا وہ اس شہر کا ہی نہیں۔ کپور تھلے کا تھا۔ کپورتھلہ غلہ منڈی میں اس کی آڑہت تھی۔ ایک بھائی تھا اس کا چھوٹا۔

دادا چھوٹے بھائی کو شہزادوں کی طرح رکھتا تھا۔

خود سارا دن غلہ منڈی میں اناج کی بوریاں گنتا' تولتا اور چھوٹے بھائی کو اپنی آنکھوں کی پلکوں کے ہلکورے دیتا رہتا۔ چھوٹے بھائی کا نام حسن تھا۔ کہتے اسے حسنا تھے۔ حسنے کو نواب نے بگھی گھوڑا لے کے شہر میں سیر سپاٹے کرنے کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ چھوٹا بھائی سکوں بھری تھیلیاں بگھی پہ رکھ کے شہر میں پھرتے پھراتے گانے بجانے والیوں کی گلی میں بگھی لیجا کے کھڑا کرنے لگا۔ وہیں کہیں ایک چوبارے پہ ایسا چڑھا کہ وہیں بیٹھ گیا۔ رانجھے کے دادا نواب دین کو بھائی کے چلن کی خبر ہوئی تو خود اسے لینے گیا۔ بھائی سے اسے پیار بہت تھا۔ ناراض بھی ہوا' منتیں بھی کرتا رہا۔ کسی نہ کسی بہانے بھائی کو لے آیا۔ باندھ کے تو رکھ نہیں سکتا تھا جوان بھائی تھا۔ پھر نکل گیا چوری اور اگلی بار اپنی محبوبہ کو بھی بھگا کے اپنے ساتھ حویلی میں لے آیا۔

اس کے پیچھے لڑکی کے سارنگی طبلے والے بھی آ گئے۔

نواب دین کے محلے میں عجیب تماشہ ہو گیا۔ نوبت گالی گلوچ اور دھکم پیل تک آ گئی۔ نواب دین بیچ بچاؤ میں لگا تھا کہ لڑکی والوں کا کوئی بندہ نظر بچا کے لڑکی کو کھینچتا ہوا لے جانے لگا تو حسنے کے متھے چڑھ گیا۔ حسنے کے ہاتھ میں بگھی میں رکھی ہوئی تلوار آ

گئی۔اس نے کھینچ کے ماری بندہ گر گیا۔ہاہا کار مچ گئی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب انگریز کا راج ابھی پنجاب میں لدھیانے سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ کپورتھلہ میں اس وقت تک سکھوں کا راج تھا۔ جدھر گواہیاں مسلمانوں کے خلاف ہو جاتیں' مسلمان رگڑ دیئے جاتے۔ان کا مال متاع سب راج پاٹ میں ملا دیا جاتا۔

معاملہ سنگین تھا۔

نواب دین نے گھر کے اندر چاٹیوں میں بھرے سکے راتوں رات چادروں میں باندھ کے گٹھڑیاں بنالیں اور صبح ہونے سے پہلے پہلے چوروں کی طرح وہ شہر چھوڑ دیا اور انگریز کے راج میں آ گیا۔لدھیانے میں کاروباری جان پہچان تھی۔وہیں ڈیرہ لگا لیا۔پیسے بہتیرے ساتھ لے آیا تھا۔تھوڑے ہی دنوں میں لدھیانے میں ہی دوکانیں خرید لیں' کاروبار کرلیا۔چوڑے بازار کے قریب نعل بنداں دے محلے میں تین منزلہ حویلی بنالی۔اپنے چھوٹے بھائی کو کہا' تو حویلی میں رہ۔ میں کاروبار سنبھالتا ہوں۔ بھائی حسنا لڑکی کے عشق میں بری طرح لت پت تھا۔حویلی سے بھی بھاگ گیا۔جاتے ہوئے کہہ گیا۔بڑے بھائی کو کہنا میرا پیچھا نہ کرے۔میں نہیں لوٹوں گا۔یہ بھی کہنا اس بار میں اپنی عورت کے پاس نہیں گیا۔

وہ خود مرد بن کے ادھر آ گئی۔

اب میں کیوں زنانی بنوں۔

پھر کوئی گناہ تو کیا نہیں ہم نے۔شادی کر لی ہے۔اب ہم دونوں کشمیر جا رہے ہیں۔ادھر ہی کسی جھیل کنارے پہاڑ پہ رہیں گے۔

کہتے ہیں نواب دین نے اپنے بھائی کے جانے کا بڑا غم کیا۔

بہر حال کپورتھلے کی مشہور رقاصہ اسکے بھائی حسنے کی انگوٹھی میں جڑ گئی تھی۔اس کے کنبے کا فرد بن گئی تھی۔یہ الگ بات ہے کنبے میں رہی نہیں۔ورنہ نواب دین نے

اس کے رہنے کا بھی ادھر انتظام کر رکھا تھا۔ نواب دین نے حویلی کے آدھے کمرے اپنے اسی بھائی کے لیے رکھ چھوڑے تھے۔ چونکہ وہ خالی تھے اس لیے وہ مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتے رہے۔ نواب دین نے اپنے بھائی کی بڑی تلاش کرائی مگر وہ نہ اُسے ملا۔ وہ سوچتا حسنا کبھی اپنی طوائف بیگم کو لے کر گھڑی پل کے لیے مہمانوں کی طرح ہی آ جائے۔ مگر جس دن سے وہ گیا پلٹ کے نہ آیا۔ نواب دین کی زندگی میں بھی اسکے پوتے اپنے بھاگے ہوئے چچا کا ذکر سنتے رہے۔ باقیوں کو اس کا انتظار تھا یا نہیں، رانجھے کو اپنے اس چچا اور چچی سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔

رانجھے کے لیے حسنا رول ماڈل تھا۔

جیسے کسی فلم کا ہیرو۔

حسنا خوبصورت اتھرا جوان تھا۔ پتلی پتلی مونچھیں تھیں۔ بال لمبے، رنگ گورا چٹا، قد اونچا۔ جس عورت کو وہ ساتھ لے کر گیا تھا وہ اپنے محلے کے سب سے تیکھی مرچیلی اور نکھی طوائف کہی جاتی تھی۔ پورے علاقے میں نگو بائی کے نام سے مشہور تھی۔ شاید اس کا نام نگینہ ہو۔

حسنا کے جانے کے بعد نواب دین نے غلہ منڈی کا کاروبار چھوڑ کے فروٹ منڈی میں بیوپار شروع کر دیا۔ وہ سیب صرف اس لیے خریدنے اور بیچنے لگا کہ وہ کشمیر سے آتے ہیں۔ کہتا تھا ان سیبوں میں اس کے بھائی کی خوشبو ہے۔

رانجھا جب بھی اپنے دادا کی کہانی سنتا، دانت بھینچ کے سوچنے لگتا، آخر کیوں رتھلے سے راتوں رات بھاگنے کا اسے خوف کیوں ہوا۔ چچا حسنا نے ایسا کیا جرم کیا تھا۔ اپنے تحفظ میں لڑا تھا وہ۔ لڑائی میں حملہ آور مر گیا تو کیا ہوا۔ ڈرے کیوں دادا۔ کھا جاتے وہ۔ تھے کون؟

چچا حسنا کدھر گم ہو گیا؟

چچی نگو کیوں نگہ سے اوجھل رہ گئی۔ کشمیر ہے کہاں؟ کشمیر میں کہاں ہو گا وہ؟ کوئی

خط پتر آیا اس کا۔ وہ کبھی کبھار سیانوں سے یہ سوال پوچھنے بیٹھ جاتا۔ وہ مسکرا کے ٹال دیتے۔ یہ بیٹھا سوچتا رہتا۔ کہیں بھی چلا گیا۔ تھا دھن کا پکا۔ جو دماغ میں اس کے فتور چڑھ گیا۔ اس نے چڑھائے رکھا۔

رانجھے کو دماغ کا فتور اچھا لگتا تھا۔

بیٹھے بٹھائے وہ خود کوئی نہ کوئی فتور اپنے دماغ میں چڑھا لیتا۔ پھر اس کی کنپٹی کی نسیں ٹس ٹس کرتیں۔ ہاتھوں کی مٹھیاں کھل بند ہوتیں اور آنکھوں کے سامنے سارا منظر لال ہو جاتا۔ اس وقت کبھی کبھار اس کی چھٹی حس اسے یاد دلاتی کہ اب پلٹ جا' کوئی نہ کوئی حادثہ ہونے والا ہے۔

کئی بار وہ بال بال حادثوں سے بچا تھا۔

مگر اس دن صبح ہی صبح اس کی چھٹی حس کہنے لگی۔ آج کوئی بڑا حادثہ ہوگا۔ کسی نہ کسی کی جان جائے گی' تیرے ہاتھ سے۔ یہ احساس اسے صبح اکھاڑے میں پہلی بار ہوا تھا۔ بات تو وہاں کافی بڑھ گئی تھی۔ مگر جونہی اکھاڑے کا خلیفہ گٹو پہلوان رانجھے کے ہاتھوں چت ہوا، رانجھے نے کسی سے بات نہیں کی' کسی سے اتنی بڑی جیت کی داد نہیں لی۔ چپ چاپ اکھاڑے سے نکلا' مٹی کو جھک کے چوما' استاد کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور اکھاڑے کے ساتھ بنی دیوار پہ بندھی رسی سے تہمد اتار کے باندھی اور ٹانگوں کے اندر سے لنگوٹ نکال کے اسی رسی پہ لٹکا دیا۔ اکھاڑے کو خیر آباد کہہ دیا اور پیچھے دیکھے بغیر وہاں سے پلٹ آیا۔

اس کی نسیں ٹس ٹس کر رہی تھیں۔ آنکھوں کے آگے منظر لال سرخ ہوا تھا۔ کسی کو سمجھ نہ آئی کہ رانجھے کو ہوا کیا۔ اتنے برس بعد آج یہ خود استاد کے خلیفہ بننے کا درجہ لینے والا تھا تو اچانک یوں لنگوٹ اتار' مٹی چوم کے سر جھکا کے کیوں چلا گیا۔ ایک دو اس کے ساتھی تو اس کے پیچھے بھی بھاگے۔ مگر اس نے کسی سے کوئی بات نہ کی' نہ کسی کی سنی۔ خاموشی سے شوں شوں کرتی اپنی کنپٹی کی شریانوں کے شور میں دانت کچے' منہ نیچے کئے

چلتا گیا۔ وہ تو اس کے بھائیوں نے صبح سویرے جب رانجھے کو سبزی منڈی میں دوکان کے تھڑے پہ آ ئے بیٹھے دیکھا تو ان کا ماتھا ٹھنکا۔

دن چڑھے' اپنی مرضی سے دوکان پہ آنے والا صبح صبح کیسے آ گیا؟

مگر وہ بولے نہیں اس سے۔

سب اس کا چہرہ دیکھ کے سمجھ گئے کہ کچھ ہے ضرور گڑ بڑ' مگر ابھی فوراً پوچھنے والی نہیں۔ بھائی اس کے سترہ تھے۔ اٹھارواں یہ خود تھا۔ ان میں سے صرف چھ رہ گئے تھے۔ باقی مختلف وقتوں میں چھوٹی عمروں میں ہی مر گئے تھے۔ کبھی طاعون پھیلا دو چار مر گئے۔ کبھی ہیضہ کی وبا آ گئی وہ تین چار لے گئی۔ پلیگ آیا باقی وہ مار گیا۔ جو چھ بچے ان کی عمروں میں بہت فرق تھا۔ بڑے پانچوں بھائیوں کے بچے بھی کئی رانجھے سے عمر میں بڑے تھے۔ جب یہ پیدا ہوا تو پونے دو سال بعد اسکی ماں فوت ہو گئی۔

رانجھے کے بعد اس کی ماں انیسویں بچے کو جنم دینے لگی تو مردہ بچی پیدا ہوئی۔ بچی کے ساتھ ہی وہ بھی لدھ گئی۔ وہ تو رانجھے کی ایک بھابھی کا انہی دنوں ایک شیر خوار بچہ سردی سے مر گیا۔ اس کی چھاتیوں میں دودھ تھا۔ اس نے بیٹے کی جگہ پونے دو سال کے دیور کو اپنے ساتھ لٹا لیا۔ یوں رانجھا ساری عمر اپنی ایک بھابھی کو ہی ماں کہتا رہا۔ باپ بھی رانجھے کا چار سال بعد فوت ہو گیا۔

باپ اچھا خاصا صحت مند ہوا کرتا تھا۔ کشمیر خود جا کے سیبوں سے لدھے ہوئے باغ خریدتا تھا۔ پھل پک جاتا تو ریڑھوں' گڈوں پہ لاد کے منگواتا تھا۔

گھر میں اس کے سونے چاندی کی ریل پیل تھی۔

بنک تو اس زمانے میں ہوتے نہیں تھے۔ سارا مال متاع پیتل تانبے اور کانسی کی دیگوں اور بلٹوئیوں میں بھر بھر کے کوٹھریوں میں چھپا لیا جاتا' یا زمین کھود کے کہیں دبا دیا جاتا۔ بڑے بچے اس کے ساتھ کاروبار کرتے تھے۔ لینا دینا وہی جانتے تھے۔ رانجھے کو کیا پتہ تھا۔ چار سال کا ہی ہوا تھا کہ پتہ چلا باپ کو کتے نے کاٹ لیا۔ منڈی میں کہیں

شام کو پھلوں کے چھڑے پہ رانجھے کا باپ چلتا آ رہا تھا کہ سامنے والی گلی سے ایک کتا زمین پہ سر مارتا ہوا ڈگمگاتا ہوا آیا اور پلک جھپکتے میں اس کی ٹانگ بھنبھوڑ ڈالی۔ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ڈانگیں مار مار کے کتا تو مار دیا' رانجھے کا باپ بھی گر گیا۔ چارپائی پہ ڈال کے اسے گھر لائے۔ اگلے دن اس کا سانس بند ہو گیا۔ لوگ اس کے منہ میں پانی ڈالیں' اس کی سانس کھنچ کھنچ جائے' گردن کے پٹھے اکڑ جائیں' حلق میں عضلات کی مٹھی بند ہو جائے۔ منہ سے لعاب بہنے لگا۔ آنکھیں گھوم گئیں۔ گلہ گھٹ گیا۔ آواز کی جگہ خرخر سنائی دینے لگی۔ ہوش وحواس چلا گیا۔ کبھی کبھی ذرا اسے ہوش آتی تو وہ اشاروں سے اپنی حویلی میں کہیں پڑی ہوئی تانبے پیتل کی سکوں سے بھری اور سونے چاندی سے لدی بلٹوئیوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہے مگر کہہ نہ سکے' نہ کسی کو کچھ سمجھ آئے۔ تیسرے دن مر گیا۔ اس کے مرنے کے پانچویں دن۔ رانجھے کے چاروں بڑے بھائی اکٹھے ہو گئے اور حویلی کی سب کوٹھڑیوں کے فرش توڑ توڑ کے تانبے کانسی کی گاگریں اور دیگیں نکال لیں۔

پورا دن حویلی کے تیسرے دالان میں بند گاگروں کو بیچ میں رکھے چاروں بھائیوں میں بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ ان کی عورتوں اور بچے دروازوں اور کھڑکیوں کی درزوں سے وہ منظر خاموشی اور پریشانی سے دیکھتے رہے۔ آپس میں بھی بھائیوں کی عورتیں اور بچے ایک دوسرے کو دشمنوں کی طرح دیکھتے جاتے۔ رانجھا اس سارے منظر میں اپنے انہی بھتیجوں کے ساتھ ساتھ پھرتا رہا' جن کے ساتھ رہ کے بڑا ہوا تھا۔ ایک دو بار اس کی وہ بھابھی جسے وہ ماں کہتا تھا اسے پکڑ کے دالان کی طرف بھی لے کر گئی اور ہاتھ ہلا ہلا کے اس کی طرف اور دالان میں بیٹھے چاروں بڑے بھائیوں کے درمیان پڑی تانبے کی گاگروں کی طرف اشارہ کر کے زور زور سے کچھ کہتی رہی۔ مگر وہاں کسی نے اسے رکنے نہ دیا۔

رانجھے کو پوری کہانی کوئی دس سال بعد سمجھ آئی۔

اس کا باپ جب فوت ہوا تو اسے یہ تک معلوم نہ تھا کہ اس کے باپ کا نام نھو خان ہے۔ نہ اسے یہ پتہ تھا کہ نھو خان انتیس کمروں کی تین منزلہ حویلی کا مالک ہے اور مرتے وقت اس نے انیس دیگیں سکوں اور زیورات سے بھری چھوڑی ہیں۔ یہ تو ہولے ہولے اسے بعد پتہ چلا کہ پورے دو دن اس کے بھائی حویلی میں آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے۔ آخر سکوں اور سونے چاندی سے بھری ہوئی دیگوں کو آپس میں بانٹ لیا۔ مگر بانٹ بھی کچھ ایسے ہوئی کہ انیس میں سے نو دیگوں کو زمین پہ ڈھیر کر کے برابر کی ڈھیریاں بنا کے بانٹا گیا۔ باقی دس دیگیں الٹائے بغیر ہی آپس میں بانٹ لیں۔

رانجھے کو اس وقت کچھ باتوں کی سمجھ آ گئی جب اس کے سب سے بڑے بھائی گامے نے چار گلیاں چھوڑ کے چوڑے بازار کے عین بیچ پندرہ دوکانیں خریدنے کے علاوہ خرادیاں والی گلی کے پیچھے بستی بازار کے ساتھ حضوری سڑک پہ مکانوں کی پوری قطار بھی خرید لی۔ تب رانجھے کو پتہ چلا کہ اس رات اس کے باپ کی الٹائے بغیر بانٹی گئی دیگوں میں سے بڑے بھائی کے حصے میں دو سونے چاندی کے زیورات والی دیگیں بھی چلی گئی تھیں۔

بعد میں اس بات پہ کبھی بھائی اکٹھے مل کے نہیں بیٹھے۔

ان کے بیچ فساد اور دشمنی کی ایک ایسی فضا بن گئی کہ پھر انہوں نے اکٹھے بیٹھ کے سانس نہ لیا۔ جہاں دو بھائی اکٹھے ہوتے تیسرے کے خلاف باتیں شروع کر دیتے۔ تین اکٹھے ہوتے تو چوتھے کی برائیاں ہوتی رہتیں۔ اس کے بڑے بھائیوں میں زیادہ سے زیادہ تین آپس میں کبھی کبھار اکٹھے ہو جاتے تھے۔ مگر سب سے بڑا' چوتھا کبھی ان میں آ کے نہ بیٹھتا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں بڑا بھائی شہر کے امیر آدمیوں میں سے ایک بن گیا۔ گامے سے چوہدری غلام محمد ہو گیا۔ اس نے اپنا گھر بھی ایسی کھلی سڑک پہ خریدا جس پر اس کی بگھی آ جا سکے۔ ہولے ہولے اس نے اپنے مرحوم باپ کی حویلی

کی طرف جانے والی گلی میں آنا جانا ہی چھوڑ دیا۔ اسے ایک دم سے وہ گلی بہت تنگ اور چھوٹی معلوم ہونے لگی۔ رانجھا جوں جوں بڑا ہوتا جا رہا تھا' توں توں اسے دادا کے زمانے سے باپ کے مرنے کے بعد تک کھچڑی پکی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ اسے سب برے لگتے تھے۔ کسی سے جڑ کے بیٹھنے کا شوق نہ تھا۔ صرف ایک ہی شوق رہ گیا تھا اسے۔ پہلوانی کا۔

وہ صبح سویرے اٹھتا۔ لنگوٹ کس کے تہمد باندھتا' تولیہ کندھے پہ رکھتا' سر پہ پرنا باندھتا اور کمیٹی چوک کے قریب جا کے شیرانوالہ باغ کی نکر کے پاس بنے اکھاڑے میں ڈنڈ پیلتا پسینے پسینے ہوتا رہتا۔ اکھاڑے میں کسّی لے کر اترتا تو اکیلا چودہ گز لمبے اور بارہ گز چوڑے اکھاڑے کی چکنی مٹی کو اتھل پتھل کرتے کرتے اس کا ملیدہ نکال دیتا۔ مٹی کا میدا بنا دیتا۔ پہروں اس مٹی میں دھنسا گھنٹوں کشتی لڑتا رہتا۔ مگر اس دن اچانک اس کی چھٹی حس اس کی کنپٹی پر چیخی۔

بچتا'

آج تیرے ہاتھ سے کسی نے مرنا ہے۔

پہلی بار اس وقت اس کی نس کنپٹی کے اندر ہلی تھی۔ جب یہ اپنے دھیان میں صبح صبح ایک خالی خولی گلی میں اکھاڑے کی طرف چلا آ رہا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ چڑیاں گھروں کی قطار میں لکڑی کی بالکونیوں کی درزوں سے چونچیں نکال کے چوں چوں کا شور مچا رہی تھیں۔ کہیں کہیں کوئی بلی تیزی سے چور محبوبہ کی طرح بھاگ کے گلی کے ایک مکان سے نکل کے دوسری طرف کے مکان کی ڈیوڑھی میں گھس جاتی۔ رانجھا اپنی اینٹوں لگی لال فرش والی گلی سے نکل کے ایک بڑی سڑک پر آ گیا۔ حضوری سڑک پر۔ ابھی اجالا اتنا نہیں ہوا تھا کہ آدمی سامنے سے چلے آتے آدمی کو چار قدم سے پہچان لے۔ ویسے بھی اتنی صبح اکا دکا آدمی ہی وہاں آ جا رہے تھے۔ کہیں کہیں خاکروب سڑک پر جھاڑو دیتے نظر آ جاتے تھے۔ یا صبح صبح سبزی منڈی جانے والے

بیوپاری پانچ چھ جیبوں والی بنیان نما جیکٹ قمیض کے اوپر پہنے ہوئے تیز قدموں سے چلتے نظر آتے تھے۔ یہ اپنے خیال میں مگن چلا جا رہا تھا کہ شراپ سے گندے پانی کا ایک ریلا اس کے منہ پر آن پڑا۔ اس کے دماغ کی ایک شریان ایک دم سے دب کے پٹاخے کی طرح پھٹی۔ اس نے آگ بگولا ہو کے کپڑے سے اپنا منہ صاف کر کے سامنے دیکھا تو ایک بڑے محل نما مکان کے تھڑے پر ایک گنجہ سا ناٹا چھوٹی چھدری داڑھی، بڑی بڑی الجھی ہوئی مونچھوں اور ماتا داغ بھرے سانولے چہرے پر تمسخرانہ مسکراہٹ لیے پنڈلیوں سے دھوتی اوپر کیے جھاڑو لیے فرش دھو رہا تھا۔ رانجھے نے غصے سے چلا کے اس آدمی کو پکارا'

تجھے دکھتا نہیں ہے۔ اندھا ہے!

وہ آدمی جھاڑو روک کے' پیر پانی میں جھاڑتا ہوا اپنی پنڈلیوں سے تہمد نیچے کرتے ہوئے رانجھے کو غور سے دیکھنے کی نمائشی کوشش کرنے کے بعد پہچاننے کا تاثر دے کر بولا۔

کون رانجھا بابو ہے؟

رانجھا غرایا' اندھا ہو گیا ہے بدتمیز۔ کس طرح پانی پھینکا ہے۔

ہم تو ملازم ہیں جی' تمیز دار اپنی گلی میں رہیں نا۔ بڑے مکانوں کی صفائی تو اسی طرح ہوتی ہے۔

تیری ایسی تیسی۔

رانجھا ایک دم سے اس آدمی پہ اچھلا۔ ابھی اس نے اس محل نما بڑے گھر کے تھڑے پہ پہلا پیر ہی رکھا تھا کہ اسے یاد آ گیا کہ وہ گھر تو اس کے بڑے بھائی گامے کا ہے۔ رانجھا وہیں رک گیا اور اس کے دماغ کی نسیں سانپ کی طرح اسے ڈسنے لگیں۔ اسی وقت اس کی چھٹی حس اس کے اندر کنڈلی ڈال کے بیٹھ گئی۔ ایکا ایکی میں وہ ملازم گھر کے اندر کھسک گیا اور رانجھا تھڑے سے اترا تو اس کی ٹانگوں کے پٹھے اکڑ گئے۔

بازوؤں کی مچھلیاں اکڑ کے پتھر بن گئیں وہ ایک ایک قدم دریا کی الٹی لہروں کے خلاف چلتا چلتا اکھاڑے پہنچا۔

اکھاڑے میں پہلے تو وہ کافی دیر کسّی لے کر مٹی کا ناتا توڑتا رہا۔ اتنے میں اس کے ساتھی سنگی بھی آ گئے۔ حسبِ معمول کشتی کے داؤ پیچ ہونا تھے۔ استاد بھی اس کا آ کے بیٹھ گیا اکھاڑے میں۔ شاگرد اکٹھے ہو کے رانجھے پر مٹی ڈالنے لگے۔

یہ اشارہ تھا کہ اب ہتھ جوڑی کرو، جس سے استاد کہے۔

استاد نے رانجھے کو نظر بھر کے دیکھا تو رانجھا پہچانا نہ جائے۔

استاد پہچان گیا کہ کچھ ہوا ہے انہونا۔

ورنہ یہ سانڈ آج 'بپھرا ہوا شیر نہ دکھتا۔

آج یہ کسی تند تیز لہر میں ہے۔ چھوٹے موٹے شاگرد کیا زور کریں گے اس سے کسے کہوں اسے ہتھ جوڑی کے لیے۔

سوچتے سوچتے استاد نے اپنے خلیفے گٹو پہلوان کو اشارہ کیا کہ رانجھے سے کشتی کرے۔

رانجھا' استاد اور خلیفہ کے علاوہ سب سے کشتی کرتا تھا۔ استاد کے انہونے حکم سے چونکا۔

اکھاڑے کے باقی لڑکوں نے بھی گردنیں موڑیں۔

گٹو پہلوان ایک دم اچھنبے سے اپنا نام سن کے کھڑا ہو گیا۔

پہلے تو اس کے چہرے پہ یہ رنگ آیا جیسے اس کے عہدے کو چیلنج کیا گیا ہو۔ پھر جیسے ایک پل میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ ابھی سب کی غلط فہمی دور کر دیتا ہوں۔

اپنے پٹھوں اور استادی گروں کے زعم میں گٹو پہلوان، رانجھے کی بدلی ہوئی کیمسٹری سے انجان، ایک دم سے سامنے آ کر رانوں پہ ہاتھ مار کے تکبر سے مسکرانے لگا۔ یہی نہیں، اپنے دونوں ہاتھوں کو کھول بند کر کے رانجھے کو حملے میں پہل کے لیے

اکسانے لگا۔ رانجھے کو اس نے شاید دوسری بار ہی ہاتھ کے اشارے سے آ آ کا اشارہ کیا تھا کہ رانجھا چیتے کی طرح اس پہ جھپٹا اور اس کی ناک پر ہتھیلی مار کے دائیں پیر کی ٹھمی سے نیچے گرا کے اس کی ایڑھی پکڑ کے سارے اکھاڑے میں اس کا سہاگا پھیرنے لگا۔ اکھاڑے کا ہر بندہ ششدر رہ گیا۔ استاد اچھو پہلوان گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔

ہیں!

یہ ہوا کیا۔

رانجھے نے خلیفے کو اکھاڑے میں یوں بجلی کی سی تیزی سے تین چکر دیے اور پھر اس کی ٹانگ گیلے کپڑے کی طرح نچوڑ کے اپنی بائیں پاؤں کی ایڑ سے اچھال کے تین گز پرے پھینکا اور جمپ لگا کے اس کے سینے پہ گوڈا مار کے چت کر دیا۔

خلیفہ گٹو پہلوان، بچپن سے رانجھے کے ساتھ زور کرتا آیا تھا۔ رانجھا اس کے سامنے ایسے تھا جیسے مرغے کے سامنے چوزا۔ گٹو کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔

یہ آج رانجھے کو کیا ہوا۔

اس کی آنکھیں رانجھے کو ایسے تک رہی تھی جیسے کمان دار اپنے کسی باغی سپاہی کو تکتا ہے۔ یہ سب آسمانی بجلی کے کوندے کی طرح آناً فاناً ہوا۔ خلیفہ ابھی تک اکھاڑے میں چت پڑا تھا۔

اکھاڑے میں خلیفہ، استاد کے بعد سب سے بڑا رینک ہوتا ہے۔

کسی چھوٹے سے خلیفے کا یوں چت ہونے کا مطلب تھا خلیفے کے سر پہ جو طاقت اور عہدے کا مور پنکھ تھا' وہ اتر گیا۔ وہ ایک دم سے جرنیل سے سپاہی ہو گیا۔ استاد اچھو پہلوان اٹھ کے رانجھے کی طرف سنبھل سنبھل کے دو قدم چلا۔ پھر راہ میں رک گیا اور محتاط آنکھوں کی ترچھی نگاہ سے رانجھے کو دیکھ کے اسے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔

رانجھا اشارے کی تعمیل میں استاد کی طرف چلا تو استاد کی آواز آئی۔

آج خلیفہ بدل گیا۔لیکن کسی دن ایک دنگل اور ہوگا۔
رانجھے کی کنپٹی کی نسیں اس وقت شور مچانے لگیں۔
خبردار!
خبردار!
رانجھے نے اکھاڑے سے نکل کے بندھی رسی پر لٹکتی اپنی تہمد کھینچ کے اتاری۔تہمد کے نیچے سے اپنا لنگوٹ اتارا اور رسی پر ڈال دیا۔پھر آ کے استاد کے پیروں کو چھوا اکھاڑے کی مٹی کو ہاتھ میں لے کر چوما اور ماتھے پہ ہاتھ رکھ کے سب کو سلام کرتا ہوا پیچھے دیکھے بغیر اکھاڑے سے نکل آیا۔
استاد اچھو پہلوان اور مٹی میں گرے چت پڑے شرمسار گٹو پہلوان سمیت، اکھاڑے کے سب پہلوانوں کی ششدر حیران نگاہیں جاتے ہوئے رانجھے کی پشت تکے جا رہی تھیں۔
رانجھا اکھاڑے میں جرنیل کا رینک جیت کے، اپنی وردی ہی اتار کے چلا گیا۔
اکھاڑے سے مستعفی ہو گیا۔
یہ واقعہ پہلے واقعے سے بھی زیادہ محیر العقول تھا۔
رانجھے کو کیا ہو گیا؟
ہر کوئی سوچے جائے۔
رانجھا سیدھا منڈی میں اپنی سبزی کی دوکان پر چلا گیا۔
دماغ کی نسیں ابھی تک ٹس ٹس کئے جا رہی تھیں۔
''آج تیرے ہاتھ سے کسی نے مرنا ہے۔''
اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔
دوکان پر آ کے رانجھے نے پانی کی بالٹی میں دونوں ہو کے ہاتھ بھر کے سر منہ دھویا۔منہ پر چھینٹے مارے۔پھر اپنی دوکان پر سبزی ٹوکروں میں سجانے لگا۔جب سے

یہ جوان ہوا تھا اس کے بڑے بھائی مندو نے، جس نے اسے بیٹوں کی طرح پالا تھا اپنی ہی دوکان کے برابر اسے ایک دوکان بنا دی تھی۔ یہ بیٹھ کے سبزی بیچتا، بڑی منڈی سے اس کا بھائی اپنے لیے سودا لاتا تو اس کے لیے بھی لے آتا۔ دوکان پر سبزیاں سجانا، بیچنا رانجھے کی اپنی ذمہ داری تھی۔

گرمیوں کے موسم کے بعد نئی نئی خوشگوار خنک سی ہوا میں تازگی بھری تھی۔ رانجھے نے سبزی کی ٹوکریوں میں پالک، مولیاں اور میتھی سجانی شروع کر دی۔ گوبھی کے پھول پانی کی بالٹی میں دھو دھو کے ایک طرف چن دیئے۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے ایک گائے آ کر اس کی مولیوں کے ٹوکرے میں منہ ڈالنے لگی۔ ہش ہش کرتا ہوا رانجھا گائے کی طرف ہاتھ لہرا کے اٹھا۔ گائے ذرا سا منہ پیچھے لے جا کے پھر مولیاں کھانے لگی۔

ان دنوں شہر میں آوارہ گائیاں بہت پھرا کرتی تھیں۔

ان کا شہر کی گلیوں بازاروں میں پھرنا ایسا پر اعتماد ہوتا تھا جیسے خلیفہ اکھاڑے کے احاطے میں پھرتا ہے۔

ہندو عورتیں انہیں اپنے گھروں سے دیسی گھی میں ڈوبے ہوئے شکر ملے پیڑے لا لا کر کھلاتیں۔ کوئی اناج بھری بالٹیاں لا کے ان کے آگے رکھ دیتے۔ جدھر ان گائیوں کا جی چاہتا وہ چرتی پھرتی رہتیں۔ کھا کھا کے ان کے جسموں پر منوں چربی چڑھی ہوتی۔ سینگ بڑے بڑے ہوتے۔ آنکھیں صحت سے دمک رہی ہوتیں۔ کھال ڈھلی ہوئی چمکتی ہوتی۔ انہیں شہر میں کوئی کسی چیز سے منع نہ کرتا۔ کوئی ہاتھ کے اشارے سے منع کرنے کی کوشش بھی کرتا تو وہ گائیاں سمجھتیں مذاق کر رہا ہے۔ سارا شہر ان گائیوں کے لیے اپنے گھر کا صحن تھا۔ نہ کوئی انہیں پکڑتا، نہ پکڑ سکتا۔ جہاں ان کا جی چاہتا وہ چلی جاتیں۔ جہاں رات پڑ جاتی وہیں بیٹھ کے سو جاتیں۔ کبھی دیکھو بیچ بازار میں بیٹھیں جگالی کر رہی ہیں۔ کبھی گھروں کے دروازے آگے گوبر کے ڈھیر لگا

دیتیں۔ کبھی دوکانوں کے تھڑوں کے پاس کی جگہ پیشاب سے جل تھل کر دیتیں۔ کوئی برا نہ مناتا۔ بڑے بڑے ساہوکار ہندو اسی قسم کی گائیاں خرید خرید کے آوارہ چھوڑ دیتے تھے۔ اکثر ہندو کسی مشکل گھڑی سے فیضیابی کی صورت میں یہ منت مان لیتے کہ بھگوان کرپا کرے تو گاؤ ماتا لے کر شہر میں چھوڑوں گا۔ سارا شہر گاؤ ماتاؤں کی یلغار کی زد میں ہوتا تھا۔ کبھی کبھار تو چھوٹے چھوٹے معصوم بچے ان بھاگتی دوڑتی گائیوں کے پیروں تلے آ کے کچلے جاتے۔ مارے جاتے۔ انہی گائیوں میں انہی کی طرح کے آوارہ سانڈ بھی ہوتے۔ ان کی منڈلی سے گائیوں کو تنہائیوں کا دکھ بھی نہ رہتا۔ جہاں ان کے من میں ملاپ کی خواہش کنڈلی بدلتی، وہیں پچیس من کی گائے پہ پینتیس من کا سانڈ اچھل کے چڑھ جاتا، بھرے بازار میں راہگیروں کو سرِ عام ایک دیدنی منظر مفت دستیاب ہو جاتا۔ شہر کے بیچوں بیچ ان گائیوں اور سانڈوں کا پورا ایک جنگل تھا۔

انہی میں سے ایک گائے اس صبح رانجھے کی دوکان کی مولیوں پر پل پڑی۔

رانجھے نے دو تین بار منع کیا۔

وہ ادھر سے منع کرتا وہ دوسری طرف سبزی کھانا شروع کر دیتی۔

رانجھا زچ ہو گیا۔

اس کی کنپٹی کی شریانوں کی نبض سے پسینے کی ایک بوند ٹپکی، وہ دونوں گھٹنوں کے بل اٹھ کے کھڑا ہوا۔ آگے بڑھ کے مولیوں کے ٹوکرے میں جھکی گائے کی گردن کے اوپر مڑے دونوں سینگوں میں سے ایک کو بائیں ہاتھ سے پکڑ کے اپنے سامنے کیا اور پھر دائیں ہاتھ کا مکا بنا کے گائے کی کنپٹی پر مارا۔ مکا لگتا تھا کہ گائے نے دوبارا آنکھیں گول گھما کے آگے پیچھے اور گولائی میں سر کو چکر دیا۔ اس کا جسم کپکپایا اور وہ دھم سے گر گئی۔ پچیس من کی گائے زمین پر لڑھک گئی۔ چاروں ٹانگیں اس کی ہوا میں تھوڑی دیر تک کھل بند ہوتی رہیں۔ پھر وہ ایک دم سے ٹھنڈی ہو گئی۔ مر گئی۔

پورے بازار میں شور مچ گیا۔

لوگ اکٹھے ہو گئے۔

گائے مر گئی۔

گاؤ ماتا مار دی۔

ہائے ماتا۔

رانجھے نے مکا مارا۔

مسلے نے گاؤ ماردی۔

ظلم ہو گیا۔

ماتا ماردی مسلمان نے۔

رام رام۔

توبہ توبہ۔

پہلے ایک مجمع لگا۔ پھر مجمع میں دو ٹولیاں ہو گئیں۔

ہندو ایک طرف اکٹھے ہونے لگے۔ سر جوڑ کے بیٹھ گئے۔

بدلہ لینا ہے۔

ماتا کے بدلے بندہ ماریں گے۔

مسلمانوں نے سن لیا۔

تمہاری ایسی تیسی۔

خبردار۔

ٹھہرو۔

ہٹ جاؤ۔

چھوڑنا نہیں۔

آؤ۔

رام بھلی کرے، ماریں گے۔

مار کے دیکھ لالہ۔

لوگ بیچ بچاؤ کرنے آ گئے۔

ہندو ساہوکار ایک طرف ہو گئے۔

ساہوکاروں کی لڑائی کا چلن اور ہوتا ہے۔

وہ ہاتھ سے نہیں لڑتے، کھوپڑی سے لڑتے ہیں۔

ان کا زور ان کا پیسہ ہوتا ہے وہ پیسے سے لڑتے ہیں، لڑاتے ہیں۔

کوتوالی چلو۔ ہتھ کڑی لگوائیں گے۔

چھوڑنا نہیں۔

چلو۔

ہندو ساہوکاروں نے چادر بچھا دی۔

آپس میں پیسے جمع کرنے شروع کر دیئے۔

تھانے میں رپٹ لکھوا دی گئی۔

تھانے کے اہل کار مالوں مال ہو گئے۔

مسلمان بھی اکٹھے ہو گئے۔

ہم بھی چندہ کرتے ہیں۔

رانجھے کے سبھی بھائی جمع ہو گئے۔

ہم مر تو نہیں گئے۔ چندے کی ضرورت نہیں۔

ہم ہیں۔

لو بھئی۔ تھانے رپٹ لکھی گئی۔

ہتھ کڑی نہیں لگنے دینی۔

چاہے تھانے دار کو چاندی میں تولنا پڑ جائے۔

رانجھے کے بڑے بھائی چوہدری غلام محمد کو بھی کسی نے خبر پہنچا دی۔ کہ تیرے

بھائی کو ہتھ کڑی لگوانے کا انتظام ہو رہا ہے۔

وہ بگھی پر بیٹھ کے آ گیا۔

خبردار، میں ہوں۔

ادھر منڈی میں اس کے باقی بھائیوں نے پہلے ہی ایک ٹوکرے سے مولیاں نکال کے کپڑا بچھایا ہوا تھا۔ پیسے جمع ہو رہے تھے۔

کپڑا اٹھالو میں آ گیا ہوں۔

دیکھتا ہوں کون رانجھے کو ہتھ کڑی لگواتا ہے۔

رانجھے کے ہاتھ سے گائے کا مرنا، سارے بھائیوں کے ملنے کا بہانہ بن گیا۔ وہ بڑے بھائی سے باری باری گلے لگ کے رونے لگے۔

حوصلہ رکھو۔

یہ کونسا مسئلہ ہے۔

دیکھتا ہوں لالوں کے پاس کتنے پیسے ہیں۔

مقابلہ پیسے والوں میں تھا، اس لیے ساری جنگ پیسے سے لڑی جانے لگی۔

مقدمہ چل پڑا۔

تاریخیں پڑنے لگیں۔

دو سال مقدمہ چلا۔

ہر تاریخ پر رانجھے کے بھائی ایک چاٹی میں سکے بھر کے ایک نوکر کے سر پر رکھوا کے عدالت کی طرف چل پڑتے۔ ان گنت تاریخیں پڑتی گئیں۔ دونوں طرف سے چاٹیوں کے منہ کھل گئے۔

ہر عدالت میں ریڈر، محرر اور وکیل ہوتے ہیں۔

ان کے وارے نیارے ہو گئے۔

ہر پیشی پر دونوں طرف سے ٹولیاں عدالت کی طرف جاتیں۔ تانگے، بگھیاں

پیدل ہجوم ہر بار کچہری میں اکٹھا ہو جاتا۔ باتیں' باتیں۔ وہ یہ کہہ رہا تھا۔ اس نے اس کو یہ کہا۔ یوں ہو گیا تو یہ ہو جائے گا۔ یہ ہو گیا تو یوں ہونا ہے۔ یہ ہے تو وہ ہے۔ وہ ہے تو یہ ہے۔ ہر منہ میں بات۔ ہر بات کا کوئی نے کوئی منہ۔ کوئی اس طرف ہے کوئی اس طرف ہے۔

درمیانی لکیر مذہب کی تھی۔

مسلمان سب رانجھے کے ساتھ'

ہندو گائے کی طرف'

بڑی بڑی پرانی دوستیاں ہل گئیں۔

ایک اس واقعے سے ہندوستان کی بساط پہ شطرنج کی جو بازی اگلے چالیس سال بعد کھیلی جانی تھی وہ شروع ہو گئی۔

یہ ان دنوں کی بات جب پہلی جنگ عظیم شروع نہیں ہوئی تھی۔ ریلوے لائن نئی نئی بچھی تھی۔ لوگوں کا ابھی کالے دھواں دیتے شور مچاتے سیٹی مارتے انجن کو دیکھنے کا شوق پورا نہیں ہوا تھا۔ سڑکوں اور گلیوں میں ابھی تک لکڑی کے کھمبوں پہ ڈوری سے مٹی کے تیل کے لیمپ بندھے ہوتے تھے۔ جنہیں جھنڈے کی طرح ہر شام ایک کارندہ' ڈوری کھینچ کے نیچے اتارتا' تیل بھرتا' چمنی صاف کرتا اور اس کی بتی جلا کے پھر ڈوری جھنڈے کی طرح کھینچ کے اوپر کھمبے کی میخ تک لے جا کے ڈوری کھمبے پہ باندھ دیتا۔ گلی بازار کے بچوں کے لیے ہر شام ان لیمپوں کا جلنا' جلانا ایک قابل دید منظر ہوتا۔

بابا بتی

بابا بتی کہتے ہوئے بچے لیمپ جلانے والے بوڑھے آدمی کے پاس جمع ہو جاتے۔ اس کا سارا تماشہ دیکھتے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگلے لیمپ تک چلتے جاتے۔ اس کے کندھے پر پڑے چمنی صاف کرنے والے کپڑے کو تکتے۔ اس کے ہاتھ میں تیل کے ڈبے' کیف کو دیکھتے' ساتھ ساتھ لائی ہوئی جلتی لالٹین نما تی کو اشتیاق سے

لٹکتے جس سے جلا جلا کے وہ سڑک کے لیمپ روشن کرتا۔ بچوں کے لیے ہر شام گویا تھیٹر کا سین تھا۔ ہر صبح پھر بابا جی ادھر سے اسی طرح ڈوری کھول کھول کے لیمپ نیچے کر کے انہیں بجھاتا۔ مگر صبح کا منظر دن کے اجالے اور شور میں دب جاتا۔ صبح بچے جمع نہ ہوتے' یا سوئے ہوتے یا کسی جلدی میں ہوتے' کوئی دہی خرید کے لے جا رہا ہے۔ کوئی دودھ کا ڈولنا ڈول تھامے جلدی جلدی چلے جا رہا ہے۔ کسی کو سکول پہنچنے کی جلدی ہے۔ کوئی کسی دوکان کارخانے میں پہنچنے کے لیے بھاگا جا رہا ہے۔ شام کا منظر بہر حال تھیٹر کا منظر لگتا تھا۔ بوڑھا بابا جی۔ خراماں خراماں چلتا آ رہا ہے۔ دھوتی باندھے' سر پر پگڑی' کندھے پر پرنا' ہاتھ میں لیمپ' کہنی کے بل میں تیل کے لٹکتے پیپے کی تار۔ لکڑی کی کھڑک کھڑک کرتی کھڑاؤں سے وہ اینٹوں کی گلی پہ' پاؤں کھینچتا چلتا آتا ہے۔ ہر ایک لیمپ پول کے پاس آ کے رکتا۔ بندھی رسی کی گرہ پھر کھلتی بچے بھاگم بھاگ آ کے جمع ہو جاتے۔

دوسرے بچوں کو آوازیں دیتے' آجا بالے دوڑ کے آ گڈی' بابا لیمپ آ گیا۔ بابا لیمپ کیا آتا چلتا پھرتا تھیٹر آ جاتا۔ وہ منظر ہوتا ہی بڑا دلچسپ تھا۔ بجھا ہوا' اندھی میلی چمنی والا لیمپ' ڈوری سے بندھا نیچے آ رہا ہے۔ صاف ہو رہا ہے' تیل سے بھرا جا رہا ہے' جلایا جا رہا ہے' پھر ڈوری سے کھینچ کھینچ کے اٹھایا جا رہا ہے۔ گلی روشن ہو رہی ہے۔ پتنگے اڑتے ہوئے ادھر جمع ہو رہے ہیں۔ پیلی پیلی روشنی کا دائرہ کھنچا گیا ہے۔

وہ تھیٹر زمانہ تھا۔

پرانی لوک داستانیں' رزمیہ قصے' پریم کہانیاں' اسٹیج پر پیش کی جاتی تھیں۔ جہاں کہیں میلا لگتا' عید شب برات کا سمے آ جاتا۔ کسی مزار پر عرس ہوتا' گردوارے پر جھنڈا ہوتا یا دیوالی' دسہرے یا بسنت کا تہوار لوگوں کو اکٹھا ہونے کی ضرورت پیش آ جاتی۔ میدانوں میں دوکانیں سج جاتیں۔ پنڈال لگ جاتے۔ کشتیاں ہوتیں' پنگھوڑے گھومتے' سرکس پہنچ جاتی۔ تھیٹر پر کھیل تماشے ہونے لگتے۔ شروع شروع میں تھیٹر میں

عورتوں کے رول بھی مرد ہی کرتے تھے۔ یا پھر ہیجڑے ہوتے تھے۔ جو زنانہ کپڑے پہن کے تھیٹر کے باہر تختوں پر ڈھولکی کی تاپ پر ناچا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ تھیٹر کی مقبولیت بڑھتی گئی۔

بازارِ حسن سے سچ مچ کی عورتیں تھیٹر کے اندر پہنچ گئیں۔ وہ عورتیں بہر حال میلوں میں شکار تو کرتی ہی تھیں۔ تھیٹر کے حوالے سے انہیں ایک جگہ مل گئی۔ ہیر رانجھا' سسی پنوں' سوہنی ماہیوال کے قصے تھیٹر پر پیش ہو گئے۔ لاؤڈ سپیکر نہیں تھا ان دنوں۔ بجلی کے آنے سے پہلے سے تھیٹر تھا۔ بڑے بڑے گیس کے ہنڈے اندر اسٹیج پر جلا کے رکھ لیتے اور اونچی اونچی آواز میں اداکار بولتے جاتے۔ گانے بجانے بھی ہوتے۔ اصلی گلوکار سب کے سامنے پورے سازندوں کے ساتھ گلا پھاڑ پھاڑ کے گاتا۔ مجرے ہوتے۔ کنجریاں ناچتیں' گاتیں' لوگ اچھل اچھل کے سکے اچھالتے۔ پولیس نظم وضبط کے لیے پہرے پر رہتی۔

نظم وضبط تھا۔

بد نظمی عام نہ تھی۔

ہر کسی کو اپنے دائرے کا پتہ تھا۔

یہ تو اب آ کے ہوا ہے کہ دائروں کی لکیریں مٹ گئیں۔

ہر کوئی یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ اس کی دسترس میں ہر شے ہے۔

اس لیے اب زیادہ فساد ہے۔

پہلے ہر ایک کو پتہ ہوتا تھا میں کون ہوں' وہ کون ہے۔

میری لکیر کہاں تک ہے۔

کہاں سے تمہاری حد شروع ہوتی ہے۔

وہ تو کبھی کبھار شراب کا نشہ کسی کو زیادہ چڑھ جاتا تو وہ حدوں کو پھلانگنے کی کوشش کر دیتا' ورنہ بڑے پرانے پینے والے بھی ان دنوں اتنا ہوش ضرور رہنے دیتے کہ

لکیریں ساری انہیں دِکھتی رہتیں۔

انہی دنوں کی بات ہے رانجھے کا ایک بھائی تھیٹر کا ایسا رسیا ہوا کہ گھر پلٹنے کا رستہ ہی بھول گیا۔ شروع شروع میں شاید یہ ہوا ہو کہ رات کو تھیٹر دیکھ کے دیر سے گھر پہنچا۔ گھر سے ڈانٹ ڈپٹ ہوئی ہو۔ اگلی بار ڈر کے مارے رات بھر نہ آیا۔ صبح وہیں کہیں چھپا رہا۔ تھیٹر کے آس پاس۔ پھر شاید رانجھے کے بڑے بھائی اسے ڈھونڈنے نکلے ہوں۔ وہ ڈر کے بھاگ گیا ہو۔ تھیٹر والوں کی منڈلی میں جا پناہ لی ہو۔

وہیں اسے تھیٹر پر کوئی چھوٹا رول مل گیا۔ وہ نین نقش کا سارے بھائیوں سے سوہنا تھا۔ پتلا' لمبا' اونچا' گورا رنگ' تیکھا ناک' موٹی آنکھیں۔ آواز سریلی۔ نام تھا اس کا شہاب الدین۔ رانجھے سے چند سال بڑا تھا۔ ورنہ رانجھے کے باقی بھائی تو اس سے بہت زیادہ عمر میں بڑے تھے۔ سب سے بڑا غلام محمد' رانجھے سے کوئی اٹھائیس سال بڑا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا عبدالرحمٰن تو رانجھے سے بھی عمر میں بڑا تھا۔ رانجھا تو اپنے دوسرے نمبر پہ بڑے بھائی مندو کے گھر پلا تھا۔ مندو بھی عمر میں رانجھے سے بیس بائیس سال بڑا تھا۔ رانجھا مندو کو اس کے بچوں کی طرح ابا کہتا تھا۔ اسی بھائی کی بیوی عائشہ کا رانجھے نے دودھ پیا تھا۔ اسے ماں کہتا تھا۔ مندو اور عائشہ دونوں بھی رانجھے کو ماں باپ کی طرح پیار کرتے تھے۔ مندو کھلے دماغ کا بندہ تھا۔ جب کسی پر غصہ آتا تو بے دریغ بول دیتا' پیار آتا تو کتنا بھی تناؤ تعلقات میں ہوتا۔ جا کے بتا دیتا۔ لین دین کا بھی کھرا تھا۔

یہی عادتیں اس کی اولاد میں بھی تھی' چار بیٹے تھے اس کے' نواب' دین محمد' سردار اور نیاز۔ رانجھا اس کے پانچویں بیٹے کی طرح اس کے گھر کا فرد تھا۔ دو بیٹیاں تھیں مندو کی۔ وہ بھی رانجھے کو چاچے سے زیادہ بھائی سمجھتی تھیں۔

مندو سے چھوٹا پنوں تھا۔

پنوں کنجوس اور پکا کاروباری آدمی تھا۔ زبان کا بڑا نفیس تھا۔ مجال ہے جو کسی کے

لیے کڑوی بات کرے۔ اس کے بھی چار بیٹے تھے طفیل' جانی' شیدا' اور شریف۔ بیٹیاں تین پھیلاں' متاں اور شیداں۔ طفیل رانجھے کا ہم عمر تھا۔ طبیعت میں اس کے بڑا پیار تھا۔ کاروبار پر وہ توجہ زیادہ نہ دیتا۔ دوستیاں بناتا۔ جانی اپنے چاچا شہاب الدین کی طرح تھیٹر کا دلدادہ تھا۔ باقی دونوں شیدا اور شریف رانجھے سے عمر میں کافی چھوٹے تھے۔ اس کے پہلوانی ڈیل سے سہمے رہتے۔ پنوں سے چھوٹا شہاب الدین تھا۔ جو تھیٹر کے چسکے میں گھر سے بھاگ گیا تھا۔ تھیٹر والوں کی منڈلی میں ایسا گیا کہ پھر انہی کا ہو گیا۔ پہلے چھوٹے چھوٹے رول سٹیج پر کیے اس نے۔ پھر کسی بڑے تھیٹر گروپ میں جا گھسا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اسے مین رول ملنے لگے۔ ہیر رانجھا کی کہانی اسٹیج پر دکھائی جارہی تھی تو شہاب الدین رانجھا بنا ہوا تھا۔

کبھی کبھی تو اسے رانجھے کی جگہ ہیر کا رول بھی کرنا پڑتا۔ دیکھنے میں خوش شکل تھا۔ تھا بھی نازک اندام۔ لڑکیاں پہلے پہل اسٹیج پر آنے سے کتراتی تھیں۔ اس لیے میک اپ کر کے شہاب الدین ہیر بن جاتا۔ وہ تو جب اصلی لڑکیوں کے قدم اسٹیج پر پڑے تو شہاب الدین گھر کا راستہ ہمیشہ کے لیے بھول گیا۔ لدھیانے سے تھوڑے ہی عرصے میں پھرتا پھراتا بمبئی جا پہنچا۔ بمبئی میں ان دنوں انگلستان سے ایک آدمی فلم بنانے کا سامان لے آیا تھا۔ خاموش انگریزی فلمیں ہندوستان میں دکھائی جاتی تھیں۔ تھیٹر کے شوقین چلتی پھرتی تصویریں دیکھتے تو دانتوں میں انگلیاں دبا لیتے۔ انگریزوں کی دیکھا دیکھی بمبئی میں بھی خاموش فلمیں بننے لگیں۔ وہ شاید تیسری خاموش ہندوستانی فلم تھی جس کا ہیرو شہاب الدین تھا۔ اسکی فلم لدھیانے میں بھی پہنچ گئی۔ شہروں میں دھڑا دھڑ مکان دوکان گرا کے لوگ سینما بنانے لگے تھے۔ کاروباری لوگ اس کاروبار کا بڑا سنہرا مستقبل دیکھ رہے تھے۔ شہاب الدین کی جہازی سائز کی تصویریں لدھیانے کے سینما کے باہر لگیں تو لوگوں نے اپنے شہر کے ہیرو کو پہچان لیا۔

شہر میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔

لوگ راہ چلتے رانجھے کو روک کے شہاب الدین کی باتیں شروع کر دیتے۔ یہ اکھاڑے میں کشتی لڑ رہا ہوتا تو اکھاڑے کے باہر کشتی دیکھنے وہ لوگ بھی رک جاتے جنہیں کشتی سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی۔ یہ دوکان پر مولیاں گاجریں دھو دھو کے رکھ رہا ہوتا تو کئی فلم بین بلاوجہ رانجھے سے سبزیوں کے بھاؤ تاؤ کرنے لگتے۔ رانجھے کی شکل سارے بھائیوں میں شہاب الدین سے زیادہ ملتی تھی۔ شاید بڑوں کی بھی ملتی ہو۔ مگر وہ عمر میں شہاب الدین سے اتنے بڑے تھے کہ ان سے مشابہت کے لیے شہاب الدین کو کریکٹر رول ادا کرنا پڑتا۔ شہاب الدین ہیرو بن گیا تو تانگے کے پیچھے اس کی تصویر لکڑی کے فریم میں کپڑے پر تنی ہوئی ہوتی اور تانگے میں ڈھولکی والا گھنٹی کی تان پر دھب دھب ہاتھ مارتا سارے شہر میں اس کی شکل دکھاتا پھرتا۔

شروع شروع میں تو یہ بات رانجھے اور اس کے دوسرے بھائیوں کے لیے بڑی شرمندگی کا باعث بنی۔ لوگ آ آ کے انہیں گھورتے' ان کی طرف انگلیاں کر کر کے ناگواری سے منہ پھیر پھیر کے سامنے آ کے نکل جاتے۔ یہ خود ایسے موقعوں کو بھانپ کے سر نیچے کر کے شرمندگی سے راہ بدل لیتے۔ وہ تو جب خاموش فلموں کے بعد بولتی فلمیں سینما میں آ گئیں تو لوگوں کی رائے بدلی۔

رائے بدلنے میں فلم کے موضوعات کا بھی بڑا دخل ہے۔

پہلی فلم ۱۹۱۸ء میں بنی تو اس کا نام تھا کرشنا جمنا۔ کہانی تھی کرشن جی کی۔ ہندو' سینما کی سکرین پر کرشن مہاراج کو دیکھ کے زمین پر ماتھا ٹیک کے بیٹھ جاتے۔ پہلے پہل کے فلم ساز بھی دھن ویراج گوند پھلکی تھے۔ لوگ انہیں دادا صاحب کہتے۔ وہ اپنے لوگوں کی نبض دیکھ کے اوپر تلے فلمیں ہی ایسے لے آئے کہ ہندوؤں نے سینما کو مندر سمجھ لیا۔ ہندوؤں کی دیکھا دیکھی مسلمان مغل بادشاہ اور شہزادوں کی کہانیاں سکرین پر لے آئے۔ لوک داستانیں' تاریخی احوال' پریم کہانیاں سب سکرین پر آ گئیں۔ اداکار بڑے بڑے بنگلوں میں بمبئی میں رہتے۔ کالے شیشے کی عینک اور مفلر

میں منہ چھپا کے باہر نکلتے کہ کہیں مجمع نہ لگ جائے۔ ٹریفک نہ سڑک کی رک جائے۔
ان کی راتیں تیز روشنیوں میں کیمروں کے سامنے گزرتیں یا شراب میں ڈوب کے وہ کہیں کسی پری چہرہ کے ساتھ تھکاوٹ اتارتے رہتے۔ شہاب الدین اوپر تلے فلموں میں ہیرو آنا شروع ہوا تو اس کی مت ماری گئی۔ کبھی رام بن کے سکرین پر وہ چودہ سال کا بن باس کاٹ رہا ہے۔ کہیں کرشن جی بنا' بانسری بجا رہا ہے۔ رانجھا بنا ہے تو چوریاں اسے مل رہی ہیں۔ فرہاد کا رول ملا ہے تو وہ تیشہ کندھے پر رکھے دودھ کی نہر کھودے جا رہا ہے۔
یہ انہی دنوں کی بات ہے جب شہر کے سینما میں شہاب الدین کی فلم لنکا ڈائن لگی تھی اور رانجھے کے ہاتھ سے ایک گائے مر گئی۔ شہر میں شور مچ گیا۔ کبھی ہندو آ کے رانجھے کی دوکان کو گھیر لیتے اور دھکم پیل میں اس کی سبزیاں الٹ دیتے۔ مولیاں کھینچ کے لے جاتے' گاجریں اٹھا اٹھا کے کھا لیتے اور دور جا کے پتھر مارتے۔ مسلمان بھی اکٹھے ہو کے دھاوا بول دیتے۔ ہندو بھاگ جاتے اور مسلمان اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے سینما کے باہر لگی رانجھے کے بھائی شہاب الدین کی رام جی کی شکل میں بانسری بجاتے ہوئے چہرے کی شکل کو سوٹیاں مار مار کے پھاڑ دیتے۔
مقدمہ چلا تو اس کا چرچا دور دور تک پھیل گیا۔
کہتے ہیں خبر بمبئی میں شہاب الدین تک بھی پہنچی تھی۔ مگر شہاب الدین پلٹ کے نہ آیا۔ وہ تو مقدمہ شروع ہوئے دوسرا سال تھا۔ جب ایک دن اچانک رانجھے کا بڑا بھائی چوہدری غلام محمد اپنی بگھی دوڑاتا ہوا رانجھے کی دکان کے پاس آ کے رکا تھا اور تیزی سے اترتے ہوئے بولا تھا۔
مندو کدھر ہے۔
پنوں کو بلا۔ غلام محمد کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑی تھیں۔ ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا۔ سب بھائی اکٹھے ہو گئے تو غلام محمد نے کہا کسی پڑھے کو بلاؤ' تار آئی

ہے بمبئی سے۔ انگریزی میں ہے تار۔ ایک سکول ماسٹر کو بلوا کے تار پڑھائی گئی تو پتہ چلا شہاب الدین کی طرف سے آئی ہے۔ اس کے کسی دوست نے بھیجی تھی کہ شہاب الدین ہسپتال میں بیمار پڑا ہے۔

جگر کام کرنا چھوڑ گیا ہے۔

ہائے کہتا تھا اسے شراب نہ پی۔

کلیجہ کھا گئی میرے بھائی کا یہ شراب۔ مندو رونے لگ گیا۔

کوئی اس کے پاس نہیں ہے' میرا بھائی اکیلا پڑا ہے ہسپتال میں۔

پنوں پریشانی میں ہاتھ ملنے لگا۔

اوئے بھتیرے اس کے پاس لوگ ہوں گے' تو دعا کر وہ بچ جائے۔

اب جائے گا کون اس کے پاس بولو۔

غلام محمد باری باری سارے بھائیوں کو تکنے لگا۔

میں جاتا ہوں' رانجھا ایک دم سے اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔

تو بیٹھ جا۔

پہلے تیرے ہاتھ سے مری گائے کا مقدمہ تو ٹل جائے۔

مقدمے کی خیر صلا' میں جاتا ہوں۔ رانجھا بولا۔

تو کونسا تیر مارلے گا ادھر جا کے۔

بمبئی لدھیانہ نہیں ہے۔ جدھر تو ڈنڈ پیلتا پھرے گا۔

ادھر تو تجھے رستہ پوچھنا بھی نہیں آنا۔

لوگوں نے ادھر کدوؤں کی طرح تجھے گھمائے پھرنا۔ ادھر اکھاڑے نہیں ہیں جدھر تو کشتیاں لڑے گا۔ نہ گائیاں ہیں جنہیں تو مکے مارلے گا' بیٹھ جا۔

پنوں یا مندو میں سے کوئی جائے۔

ہم دونوں چلتے ہیں۔

دونوں اٹھ کھڑے ہو گئے۔

دونوں چلے گئے تو ادھر رانجھے کے مقدمے پر میرے ساتھ کون چلے گا؟

ہیں؟

غلام محمد خشمگیں ہو کے دونوں کو تکنے لگا۔

اچھا پنوں تو جا' پھر۔

مندو بیٹھ گیا۔

ہاں ٹھیک ہے پنوں آ جا' بیٹھ بگھی میں' میں ریلوے اسٹیشن اتار دیتا ہوں تمہیں'

چل'

غلام محمد بگھی پر چڑھتے ہوئے بولا۔

تو چل بھائی' میں تانگہ لے لوں گا۔

کیوں میری بگھی میں میخیں چبھتی ہیں۔غلام محمد طنز سے بولا۔

پنوں نے سر ایسے ہلایا جیسے کہہ رہا ہو' ہاں چبھتی ہیں۔

لیکن منہ سے بولا' گھر سے ہو کے جاؤں گا'

تو چل۔

بگھی چل پڑی تو پنوں نے پیچھے سے آواز دی۔''شہاب الدین کا پتہ تو دیتے جاؤ بھائی۔''

غلام محمد نے بگھی میں بیٹھے بیٹھے، مندو کی طرف اشارہ کیا''اسی کے پاس تار ہے۔دیکھ لینا پتہ اس میں'' اور بگھی دوڑاتا سبزی منڈی سے نکل گیا۔تار کا سن کے اور غلام محمد کی بگھی کو دیکھ کے کئی پڑوسی دوکاندار آ کے جمع ہو گئے۔شہاب الدین کی بیماری کا سن کے کئی فلم بین گاہک بھی کان کھڑے کر کے رک گئے۔

او چلو تم لوگ سب

رانجھا سب کو ہاتھ کے اشارے سے بھگانے لگا۔

ہوا کیا؟

ہوا یہ کہ شام تک لوگ رانجھے سے پوچھتے رہے۔

وہ بتاتا رہا۔

پنوں بمبئی چلا گیا۔

تیسرے دن رانجھے کی کچہری میں تاریخ آ گئی۔

اس بار غلام محمد کی بجائے اس کا بڑا بیٹا عبدالرحمٰن ساتھ تھا۔ مندو اور پنوں کے بیٹے نواب، سردار اور طفیل بھی ہمراہ تھے۔ سردار مندو کا منجھلا بیٹا تھا۔ پہلے وہ اپنی پھوپھی بیگی کی بیٹی سے بیاہا ہوا تھا۔ شادی کے دس مہینے بعد ہی وہ زچگی میں مر گئی۔ مندو نے اس کے لیے غلام محمد سے رشتہ مانگ لیا اس کی بیٹی صفیہ کا۔ غلام محمد کی ڈیوڑھی میں بگھیاں کھڑی ہوتی تھیں۔ بیٹیاں اس کی مخملی شنیل اور ساٹن کا جوڑا اتار کے چھ مہینے تک اس جوڑے کو ہاتھ نہ لگاتی تھیں۔ دونوں بانہوں میں ڈیڑھ ڈیڑھ درجن سونے کی چوڑیاں پہنے پھرتی تھیں۔ وہ مندو کے بیٹے سردار کے لیے اپنی بیٹی کی شادی پر کیسے ہامی بھر لیتا۔ سردار کا کام بھی برا نہیں تھا۔ خراداں والے بازار میں جلد سازی کی دوکان تھی۔ کئی نوکر چاکر اس نے رکھے ہوئے تھے۔ دور دور سے لوگ کتابیں کاپیاں لے کر اس کے پاس آتے۔ کپڑے کے تاجر اپنے کپڑوں کے نمونوں کی کاپیاں بنوانے کے لیے ہر رنگ اور ڈیزائن کا کپڑا لا لا کے اس کی دوکان پر ڈھیر کر جاتے۔ قرآن، سپارے، گیتا اور وید بھی جلد بندی کے لیے شہر میں اسی کے پاس آتے۔ مگر غلام محمد اپنی بیٹی جلد ساز سے بیاہ دے، وہ بھی رنڈوا، یہ کیسے ممکن ہے۔

آخر رشتے داری ہے۔

رشتے داری گئی بھاڑ میں۔

اسی طرح کی خاندان میں بحثیں ہوتی رہتیں۔

پہلے ہی بہتیری ان میں آپس میں سرد مہری تھی۔

اس بحث سے تناؤ اور بڑھ گیا۔

اسی لیے شاید اس بار غلام محمد خود تاریخ پر نہ آیا۔ اپنے بڑے بیٹے کو بھیج دیا۔ اس کا بیٹا عبدالرحمٰن اپنے باپ سے تین گنا زیادہ مغرور اور بد دماغ تھا۔ کچہری جاتے جاتے راہ میں پھر اسی رشتے داری کی بات چل پڑی۔ عبدالرحمٰن غصے سے بول پڑا۔

خبردار۔

یہ بات کسی نے کی تو۔

روکو تانگہ۔

مجھے نہیں جانا' دوٹکوں کے بندوں کے ساتھ۔

رانجھا بھی اسے تانگے میں بیٹھا تھا۔

وہ تو پہلے ہی سے پریشان تھا کہ دو سال ہو گئے' مصیبت سر سے اترتی ہی نہیں مقدے کی۔ اوپر سے بھائی شہاب الدین کی بیماری کی خبر پہنچی ہوئی تھی۔ ادھر خاندان میں الگ کھچڑی پکی رہتی تھی۔ اتنا خرچہ ہو گیا مقدمے پر۔ ہندو الگ جان کو آئے ہوئے تھے اور اب اس کا بھتیجا منہ کھول کے کہہ رہا تھا' روکو تانگہ' مجھے نہیں جانا دو دوٹکوں کے لوگوں کے ساتھ۔

عبدالرحمٰن کے کہنے پر تو تانگے بان نے تانگہ نہ روکا۔

مگر عبدالرحمٰن کی کہی بات سن کے رانجھے کی کنپٹی پر پھر شریان ہلی' چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ سر سے لے کر کمر کے آخری مہرے تک بجلی کا کوندا لپکا' اگلی سیٹ پہ سپرنگ کی طرح بیٹھا بیٹھا اچھلا' روک اوئے تانگہ۔

تانگے بان کی باگیں کھینچنے سے پہلے ہی گھوڑا بدک کے سڑک پر پاؤں رگڑتا رگڑتا کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک جھٹکے سے تانگہ رکا اور پچھلی سیٹ کے بائیں کونے پر بیٹھا ہوا عبدالرحمٰن خوف زدہ ہو کے ایک دم سے اتر گیا۔

اترا کہ نہیں زیادہ ٹکیاں والا۔

رانجھا غرا کے پیچھے مڑا۔

اتر گیا اتر گیا۔

کوئی بولا'

ٹھہر ذرا۔

رانجھا اترنے لگا غصے سے ابلتا ہوا۔

بیٹھا رہ۔

آگے بیٹھے ہندو نے تانگے والے کو چلا دیا۔

سارا رستہ رانجھا غصے سے تلملاتا رہا۔ چہرہ لال' آنکھیں شکرے کی طرح غضبناک اور کنپٹیوں پر پسینے کی بوندیں۔ نہ اس سے کسی کے ساتھ بات ہوسکے' نہ ڈرتا کوئی اس سے بات کرے۔ کچہری میں پہنچے تو آگے وہی دو سال سے چلا آتا مجمع۔

دونوں ٹولیاں آپس میں اکٹھی

بحث تکرار

ہنسی مذاق

جگتیں طنزیں

یہ تانگے سے اترا ہی تھا کہ سامنے دونوں طرف کے وکیل اکٹھے چلتے ہوئے آ گئے۔ رانجھے کی طرف کا وکیل ہندو تھا اور ہندوؤں نے شہر کا سب سے پڑھا لکھا مسلمان وکیل خریدا ہوا تھا۔ دونوں وکیل کالے کوٹوں میں ملبوس خوش گپیوں میں مصروف چلے آ رہے تھے۔ رانجھے کو تانگے سے اترتے دیکھ کر اس کی طرف چلے آئے۔

ہندوؤں کا مسلمان وکیل رانجھے کو سر سے پسینہ پونچھتے دیکھ کے ہنس کے بولا'
پہلوان جی' ابھی سے پسینے آ گئے؟ وہ شاید ابھی کچھ اور بھی کہتا۔

رانجھے نے پسینہ پونچھتے پونچھتے ایک پاؤں زمین پر رکھا دوسرا ابھی تانگے کے

پائیدان پر ہی تھا کہ ہاتھ بڑھا کے اس کے کالے کاٹ کے کالروں کے درمیان کالی ٹائی کو سفید کالروں سمیت پکڑ لیا اور ایک ہی جھٹکے سے تانگے کے پہیے میں دے مارا۔ وہ تو کئی لوگوں نے اچھل کے رانجھے کے بازوؤں کو پکڑ لیا۔ ورنہ وہ تو وکیل کی گردن توڑ دیتا۔ منہ سے اس کے جھاگ نکلنے لگی۔

''ہٹ جاؤ۔'' وہ للکارے مارتا اچھلا۔

''اوئے حوصلہ کر' پہلے مقدمے سے ابھی جان نہیں چھوٹی تیری۔'' کسی سیانے کی آواز آئی۔

''بننے دو ایک مقدمہ اور۔''

پترا ہٹ جا۔ وکیلاں نال متھا نہ لا۔

اب گائے کا نہیں وکیل کے قتل کا مقدمہ بننے دو۔

آ ادھر وکیلا۔ رانجھا للکارے مارنے لگا۔

بیچ بچاؤ کرنے والے آ گے۔

مندو نے آگے بڑھ کے رانجھے کے گال پر تڑاخ سے تھپڑ مار دیا اور ڈانٹ کے بولا۔ بس ایک لفظ نہیں اور بولنا۔

چپ۔

رانجھا مندو کو ابا کہتا تھا۔

روہانسا ہو کے بولا۔

ابا نہیں بنانے دے مقدمہ' میں اس وکیل کو نہیں چھوڑوں گا۔

مندو نے رانجھے کو کندھے پر ایک اور چپت لگائی اور آہستگی سے بولا۔

اس وکیل کو مارنے پر ہندو نہیں مقدمہ کھڑا کرتے۔

یہ گائے تھوڑی ہے' یہ مسلمان ہے۔

اس وکیل نے بھی یہ بات سن لی۔

وہ اپنی ٹائی درست کر رہا تھا۔ کان میں جب مندو کی یہ بات پڑی تو چپکے سے اِدھر اُدھر دیکھے بغیر کھسک گیا۔ ان کا اپنا ہندو وکیل بھی جو کوئی بات کرنے کے لیے منہ کھول رہا تھا۔ اس گفتگو کا نیا رنگ دیکھ کے پیچھے ہٹ گیا۔ مجمع میں تھوڑی دیر تک بڑا تناؤ رہا۔ پھر اچانک ہی لوگ اِدھر سے کھسکنا شروع ہو گئے۔ مقدمہ شروع ہونے سے پہلے کچہری کے ریڈر، کلرک، منشی بھی ان سے دور دور ہی رہے۔ کارروائی شروع ہوئی تو دونوں طرف وکیل سراسیمگی میں رانجھے کو کٹہرے میں کھڑے ایسے دیکھتے رہے جیسے چڑیا گھر میں پنجرے میں رو کے شیر کو دیکھتے ہیں۔ رانجھے کا حلیہ بھی رسہ توڑ کے بھاگے ہوئے ریچھ جیسا رہا۔ ہر ایک کو وہ لال لال آنکھیں نکال کے دیکھتا رہا۔

جج سکھ تھا۔

وہ اوپر کرسی پر بیٹھا اپنی عینک کے اوپرے کنارے سے رانجھے کی خاموش سلگتی اُبلتی شکل دیکھ کے سوالیہ نظروں سے اپنے ریڈر کو تکتا رہا۔ اس دن دونوں طرف سے بہت تھوڑی دلیل بازی ہوئی۔ زیادہ وقت جج کچھ انگریزی میں بولتا رہا۔ ٹائپ رائٹر کی ٹپ ٹپ کی آواز عدالت میں گونجتی رہی۔ اس پیشی میں فیصلہ ہو گیا۔ رانجھا بری ہو گیا۔ ایک دم سے کچہری کے باہر مسلمانوں کا پھر جتھ جمع ہو گیا۔ رانجھے کا پسینہ بھی رک گیا۔ اس کے بھتیجوں نے اسے کندھوں پر بٹھا لیا۔ جلوس کی صورت میں رانجھے کو کچہری سے منڈی میں لایا گیا۔ راستے میں نعرے لگتے آئے۔

نعرہ تکبیر، اللہ اکبر

ساڈا رانجھا،

زندہ باد۔

رانجھے دے نعرے لاواں گے۔

لالے دیاں گانواں کھاواں گے

ہندو دی گاں۔ مکے دے مار

رانجھا پہلوان۔

جیوے جیوے۔

منڈی میں چاولوں کی دیگیں پکنے لگیں۔

گھروں میں نیاز بٹنے لگی۔ کئی دن ان کے گھروں میں خوشیاں منائی گئیں۔ بچے گلیوں میں نعرے لگاتے پھرتے رہے۔ عورتیں گھروں میں مبارکیں لیتی رہیں۔ چوتھے دن فیصلے کے بعد غلام محمد کے گھر مندو گیا۔ تھوڑی بہت ادھر کی باتوں کے بعد مندو نے غلام محمد سے کہا۔ بھائی اب رانجھے کا بیاہ کرنا ہے۔ اور گائیاں نہیں مروانی اس سے۔ وکھرا ابھی کرنا ہے۔

''تو کردے۔ تجھے کس نے روکا ہے؟'' غلام محمد بولا۔

''تجھ سے صلاح کرنی ہے۔'' مندو بولا۔

''ہاں بول۔''

''میری سالی ہے۔'' مندو بولا۔

''ٹھیک ہے۔ تو نے ہی پالا ہے رانجھا۔ تیرا حق ہے۔ تیرے گھر کا حق ہے۔'' غلام محمد نے کہا۔

''تو تجھے اعتراض نہیں۔'' مندو بولا۔

''مجھے کس لیے ہونا۔'' غلام محمد جلدی میں بولا۔ جیسے جان چھڑانے کے چکر میں ہو۔

''اچھا پھر۔ اب اس کے حصے کی بھی بات کر لیتے ہیں۔'' مندو نے عجیب معنی خیز انداز میں غلام محمد کو دیکھ کر کہا۔

''کونسا حصہ اس کا''

''ابے کی وراثت میں''

''اب کونسی وراثت بچی ہے ابے کی۔ سارے فیصلے تو ہو گئے تھے۔''

"کیوں رانجھا؟ رانجھا تو چار سال کا تھا۔ جب ہمارا ابا مرا۔"

"تو"

"تو تو نے کہا تھا‘ رانجھا بڑا ہوگا‘ تو میں دوں گا حصہ‘ کہا تھا نا؟"

"اور تو جو ایک دیگ فالتو لے گیا تھا‘ رانجھے کے نام پر۔"

"کیوں پالا نہیں تھا‘ میں نے اسے"

"ہاں اسی لیے تو۔"

"تو اس کا ذکر کیوں کرتا ہے اب۔"

"پھر کس کا کروں۔"

"اس دیگ کا بول‘ جس میں ابے کے زیور تھے۔ سونا چاندی تھا۔" مندو پینترا بدل کے بیٹھ گیا۔

"واہ‘ وہ تو میری قسمت کی بات ہے۔"

"قسمت کیسے‘ حصہ تو برابر ہوتا ہے بھائیوں میں۔"

"میں نے خود مانگی تھی وہ دیگ‘ ہیں بول۔"

"اور کیا ہم نے پکڑائی تھی تمہیں۔"

"جب بند دیگوں کو کھولے بغیر لینے کی بات تھی تو۔ جو بھی کسی کے حصے میں آ گئی‘ آ گئی۔"

"تم تو بڑے ہو‘ تمہیں پتہ تھا۔"

"کیوں۔ پہلے کس نے دیگ اٹھائی تھی۔ بول۔ بغیر کھولے۔"

"پنوں تو کملا ہے۔ دیگیں ہلا ہلا کے سکوں کی آواز سن کے ایک دیگ اٹھا لے گیا تھا۔"

"اچھا‘ وہ کملا تھا‘ تو تو سیانا تھا۔ پنوں کے بعد میں نے تجھے باری دی تھی۔"

"ٹھیک ہے‘ میرے بعد شہاب الدین کی باری تھی۔"

''شہاب الدین کیوں نہیں بولا بول۔''

''مجھے کیا پتہ۔اسی کی جگہ تو نے ایک دیگ سرکالی تھی۔زیوروں والی۔''

''کیوں میرا حق نہیں تھا۔''

ہمارے لیے تانبے کے سکے، تیرا حق سونا۔واہ

''میری دیگ سے سونا نکل آیا تو تجھے تکلیف ہوگئی۔''

''شہاب الدین کے حصے کی دیگ بھی پھر تو نے ہی اٹھائی تھی۔''

''ہاں شہاب ہمارے پاس تھا۔بچہ تھا وہ بھی دیگ لے کر کدھر جاتا وہ۔''

''پھر کدھر گیا۔اس دیگ کا سونا چاندی شہاب کو تو نہیں ملا وہ۔''

''شہاب کو کہہ وہ بات کرے تو کون ہوتا ہے۔''

''کیوں میں اب کون ہو گیا' رانجھے کو کس نے پالا' گڑ بھر کا تھا۔جب سے پال رہا ہوں۔اس کا حصہ کدھر گیا۔''

''رانجھے کے حصے میں کمرے حویلی میں ہیں۔دے دے اسے دو کمرے''

''وہ تو ہیں ہی۔''

''پھر اور کیا چاہیے۔''

'گھر بسانے کے لیے اسے پیسوں کی بھی تو ضرورت ہے۔''

''ہاں ہے مانتا ہوں' ہے۔''

''پھر''

''میں نے بہتیرا اس کے لیے سنبھال کے رکھا تھا۔''

''تو''

''اب اس سے زیادہ کا اس پر خرچا ہو گیا ہے۔''

''کونسا خرچا؟''

''دو سال مقدمہ لڑا ہے۔بھولا کیوں بن رہا ہے۔''غلام محمد بولا۔

''ہم نے کہا تھا' مہنگا وکیل کرنے کو۔''

''کیوں تیرے خیال میں رانجھے کو ہتھ کڑیاں لگوا دیتا؟ ہیں۔ ڈیڑھ دیگ سکوں کی خرچ ہوئی ہے۔ پتہ ہے۔''

''ہوئی ہوگئی''

''تو جو اسے پالنے کے چکر میں ابے کے سکوں کی ایک بلٹوئی فالتو لے گیا تھا وہ کدھر گئی؟۔''

''کیوں میں نے نہیں خرچا کیا۔ مقدمے پر۔''

''فیسیں تو میں دیتا تھا وکیلوں کی۔ باقی خرچا ہی کیا تھا۔''

''کیوں اور کوئی خرچا نہیں تھا' پولیس کا منہ کس نے بند کیے رکھا۔''

''تو اب میرا منہ کیوں کھلواتا ہے۔''

''نہ تو بول''

''اپنی سالی کا رشتہ باندھ رہا ہے نا' اس لیے اب رانجھے کا حصہ یاد آ گیا۔''

''دیکھ تو سالی کا طعنہ نہ دے۔''

''کیوں نہ دوں۔''

''تو' تو دے دے اپنی سالی رانجھے کو۔''

''دیکھ۔ تو بات نہ بڑھا۔ جا چلا جا۔''

بات بھائیوں کی ہوتی ہوتی سالیوں تک آ گئی، تو بگڑ گئی صحن کے اردگرد بیٹھی ساری باتیں سنتی عورتیں زور زور سے بولتے ہوئے آپس میں لڑنے لگیں۔ مندو کی بیوی عائشہ ایک دم سے تیز تیز بولتے ہوئے اٹھی تو غلام محمد کی کشمیرن بیوی بھی بازو لہراتی ہوئی لڑنے کو عائشہ کے سامنے کود گئی۔ پنوں کی تین بیٹیاں پھیلاں' مناں اور شیداں بھی ادھر آ ئی بیٹھی تھیں۔ وہ بیچ بچاؤ کرتی رہیں خود بھی بولتی جاتیں۔ کبھی ایک بات وہ ایک تائے کی طرف کرتیں۔ تو دوسری بات دوسرے تائے کی حمایت میں۔

انہیں ابھی یہ ٹھیک سے پتہ نہیں تھا کہ انہیں حمایت کس کی کرنی ہے۔ اسی شور شرابے میں کوئی ان کی بہن بیگی کو بلا لایا۔ بیگی عمر میں مندو سے بڑی تھی۔ غلام محمد سے چھوٹی تھی مگر غلام محمد چھوٹی بہن کے آگے چپ ہو جاتا تھا۔ بیگی نے آتے ہی دونوں کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔

وہاں شور مچا ہوا تھا۔

کوئی بھاگا بھاگا گیا رانجھے کو بھی بلا لایا۔

رانجھا شیر کی طرح آنکھیں نکال کے ناک پھولاتے زور زور سے سانس لیتا ہوا بھاگا آیا۔ ڈیوڑھی میں اسے عبدالرحمٰن نظر آ گیا۔ اسے دھکا دے کر کھڑی بگھی کی گھوڑی کے کولہوں پر پھینک دیا' گھوڑی نے کسمسا کے اپنی دم لہرا کے عبدالرحمٰن کے منہ پر ماری۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اپنی ہی گھوڑی پر چھانٹے مارنے لگا۔ اتنے میں رانجھا بازو چڑھاتا ہوا صحن میں جا پہنچا۔ ابھی وہ کچھ بولنے ہی لگا تھا کہ مندو ہجوم سے نکل کے پھر رانجھے کی طرف لپکا اور اس کی گردن پکڑ کے باہر کی طرف کھینچتا ہوا بولا۔ تو ادھر کیوں آیا ہے۔ میں مر گیا ہوں۔

''ابا تیرے ساتھ کس نے جھگڑا کیا۔'' رانجھا پوچھنے لگا مندو کے ہاتھوں میں پکڑی اپنی گردن ہلا ہلا کے۔

''اوئے اونچی بولتا ہے میرے سامنے۔''

''ابا تجھے گالیاں کس نے دیں۔''

''پھر اونچی آواز نکالی ہے۔'' مندو نے پھر رانجھے کی گردن پکڑ لی۔

''اب بولوں بھی نا۔''

بول کون ہوں میں۔ بول۔

''ابا ہے۔'' رانجھا رو ہانسا ہو گیا۔

''یہ تیرے ابا کا بڑا بھائی ہے۔''

''اس سے لڑنے آیا ہے تو' تیرا بڑا بھائی ہے یہ۔ بے شرم۔''

''ادھر تیرے ساتھ مستی کرتے ہیں۔ ان کے بیٹے بھی۔''

رانجھے کے قریب سے غلام محمد کا بیٹا بشیر گزرا تو رانجھے نے اچھل کے اس کی کمر پر دھول جمادی۔ وہ کمر کھجاتا ہوا سہم کے ایک طرف ہو گیا۔ مندو نے پھر رانجھے کا بازو پکڑ کے باہر کی طرف کھینچا اور بولا تیرے سامنے نہیں بولتے' تیرے بھتیجے ہیں۔ میرے سامنے کدھر سے آنکھ اٹھائیں گے۔ اتنے میں عورتیں پھر اونچی اونچی بولنے لگیں۔ اتنی دیر میں مندو کی بیٹیاں بھی ادھر پہنچ گئیں۔

چلو۔

مندو نے سب کو ڈانٹ کے کہا۔ ''ہم بھائیوں کا معاملہ ہے۔ پھر نمٹا لیں گے۔''

سب طرف خاموشی چھا گئی۔

''سب نمٹا ہوا ہے معاملہ'' غلام محمد دور کھڑے بولا۔

''اچھا دیکھیں گے۔'' ''چل رانجھا۔''

رانجھا مندو کے پیچھے پیچھے سینہ تان کے اس گھر سے نکلا۔ باہر گلی میں آ کے مندو نے پھر رانجھے کا بازو پکڑ لیا اور رانجھا ایک دم بکری کی طرح منمناتے ہوئے سر جھکائے چلتا چلتا اپنے گھر آ گیا۔ گھر پہنچ کر اسے ساری باتوں کی خبر ہو گئی۔ کہ لڑائی کس بات پر ہوئی۔ کس نے کیا کیا کہا۔

وہ ایک دم سے چپ ہو گیا۔

تھوڑے ہی دنوں میں اس کی شادی ہو گئی۔

اس نے کوئی خوشی نہ منائی۔

بھائی اس کے اکٹھے ہو گئے۔ پنوں بھی آ گیا بمبئی سے۔ شہاب الدین بیماری کی وجہ سے بمبئی میں ہی رہا۔ رانجھے نے اپنے باپ کا کوئی حصہ کسی سے نہ مانگا۔ مندو نے جو دوکان دے رکھی تھی وہ بھی اسے واپس کر دی۔ اپنے حصے کے حویلی کے دو ڈھائی

کمرے پنوں کو بیچ دیئے۔ باہر احاطے کا حصہ گلی میں کسی کے ہاتھ گروی رکھ دیا اور وہ محلہ چھوڑ کے سات گلیاں دور رائے بہادر روڈ پار کر کے گلی آلو باریا میں جا ایک مکان خریدا۔ اس گلی میں سارے ہندوؤں کے گھر تھے۔ مسلمانوں کا صرف ایک گھر تھا۔ برابر۔ اس میں فضل الٰہی رہتا تھا۔ چوڑیوں کی ہٹی تھی اس کی۔ رانجھے کا پرانا یار تھا۔ وہی اپنے پڑوس میں برابر والے گھر لے آیا۔ رانجھے نے گھر کے پچھواڑے میں مسلمان قصابوں کے گھر تھے۔

مسلمانوں کی ایک خانگاہ تھی۔ حضرت شیر بخاریؒ کی۔

وہیں ایک خالی تکیہ تھا۔

ساتھ ہی چھوٹی سی مسجد تھی۔ مسجد کا کھوہ تھا۔ درخت لگے تھے۔ ٹالیاں، ککراں، خالی جگہ پر قوالیاں ہوتیں ہر گیارہویں کو۔ آگے پیچھے کے دنوں میں آس پاس کے قصائی اپنی بکریاں ادھر باندھ دیتے۔ خالی جگہ مسلمانوں کی مشترکہ جگہ تھی۔ شادی بیاہ، خوشی غمی میں وہاں اکٹھ ہو جاتا۔ مگر اس طرف رانجھے کے نئے گھر کا کوئی دروازہ نہ تھا۔ بس گھر کے کمرے کے پیچھے مسلمانوں کی موجودگی سے اسے تسلی تھی۔

رانجھے نے پہلوانی میں صرف یہی ایک داؤ سیکھا تھا کہ کشتی میں سامنے کی فکر نہ کرنا، پشت کے وار سے بچنا۔

پشت میں بھی وار ہو گیا۔

پیچھے مسلمانوں کی خانگاہ کے ساتھ کھلے احاطے میں بتی چوک تھا۔ چوک کے ایک طرف اونچا لکڑی کا کھمبا تھا۔ اس پر گیس کا ہنڈا لٹکا ہوا تھا۔ ڈوری سے بندھا ہوا۔ ساری رات بتی جلتی رہتی۔ بتی کے چاروں طرف مسلمانوں کے گھر تھے۔ ساری روشنی مسلمان گھروں میں جاتی۔ ان گھروں میں ایک گھر عمر دین کا تھا۔

وہ پھنے خان قسم کا آدمی تھا۔

معاش ہلکا تھا۔ مگر شوق بڑے بڑے پالے ہوئے تھے۔

بکریاں خرید کے ذبح کر کے ان کا گوشت بیچتا مگر دکھانے کے لیے پنجروں میں مور اور تیتر رکھ چھوڑے تھے۔ ہندوؤں نے اسے تاڑ لیا۔ کہ یہ بندہ اپنی حیثیت سے زیادہ کی پر لطف زندگی گزارنے کا متمنی ہے۔ اندرون خانہ اس سے ساز باز کر کے مسلمانوں کی مشترکہ درگاہ اور مسجد کی جگہ کے جعلی کاغذ اس کے نام کے بنوا کے تکیے کی جگہ کا اس سے سودا کر لیا۔ پچھواڑے کے مسلمان پڑوسی بھاگے بھاگے چکر کاٹ کے رانجھے کے پاس آ گئے۔ رانجھے نے جب دیکھا کہ پیچھے سے اپنا ہی بندہ وار کر گیا ہے تو کچہری جا پہنچا۔

مقدمہ پھر چل پڑا۔

یہ مقدمہ عجیب تھا۔

مخالف عمر دین تھا مگر اس کا مقدمہ ہندو لڑ رہے تھے۔

ہندوؤں نے خوب پیسے جمع کر لیے۔ شہر کا ایک مہنگا وکیل رکھ لیا۔ عمر دین کی چال ڈھال اور بگڑ گئی۔ پہلے ہی وہ اکڑ کے چلتا تھا۔ اب تو اس کے پیر زمین سے چار انچ اور اوپر اٹھ گئے۔ کندھے چوڑے کر لیے اس نے۔ کھینچ کھینچ کے مونچھوں کو تاؤ دینا شروع کر دیا۔ رانجھے کے ساتھی سنگی پچھواڑے کے غریب مسلمان تھے۔ وہ آ کے روز رانجھے کو عمر دین کی شرارتیں بتاتے۔

ایک کہتا آج میرے دروازے پر لات مار کے نالی میں تھوک کے گیا

دروازے پر میری ماں بیٹھی تھی۔ اسے سلام تک نہیں کیا۔

ماں نے اسے آواز دی' عمر دین' تو تکبر سے گردن گھما کے ماں کی طرف دیکھا اور ٹھوڑی اوپر کر کے کندھوں پر پڑا صافہ درست کر کے دونوں کونوں سے پکڑ کے گردن کے پیچھے رگڑ کے اکڑ کے بولا' جی چاچی۔ بول۔ ماں بولی تو نے مسیت کی جگہ کیوں بیچ دی ہندوؤں کو۔ درگاہ کا عرس اب کدھر ہوگا۔ ہمارے بچے بچیوں کی شادی بیاہ کے لیے اکٹھ کی جگہ تھی۔ سانجھی۔ عمر دین تیری جنج بھی ادھر سے گئی تھی۔ ادھر ہی تیرا

ولیمہ ہوا تھا۔ بھول گیا۔ سانجھی جگہ ہے ڈیڑھ سو سال سے سب کی۔ تو اس کا کیا لگتا ہے۔ تو نے کیسے بیچ دی۔

''بس بیچ دی اب تو' چاچی'

عمر دین شیطانی مسکراہٹ سے ہنستا ہے اور اسی طرح اکڑفوں سے بات کرتا ہے۔ جیسے اسے کوئی ڈر خوف نہ ہو۔

کچھ کر چوہدری رانجھے خاں۔

مرغے پکاتا ہے ایک دن چھوڑ کے۔ دوسرا اپنی کہانی سنانے بیٹھ گیا۔

کل مرغی چھت پر بنائی اور مرغی کے پر اٹھا کے میری چھت پر پھینک دیئے۔

ساری چھت میری پروں سے بھر گئی۔

اڑ اڑ کے پر نیچے میرے والان تک آ گئے۔ بیوی میری اوپر گئی' اس کی جورو سے پوچھنے تو وہ ہاتھ نچا نچا کے لڑنے کھڑی ہو گئی'

بولی اپنے میاں کو بھی بولو مرغی لائے۔

کھانیاں والاں تے لڑنا مرغیاں والیاں نال۔

ہم تو اس کے جوڑ نہیں رہے' چوہدری

اب تو پولیس والے اس کی بیٹھک میں آ کے بیٹھنے لگے ہیں۔

بوتلیں کھلتی ہیں ان کے لیے'

تاش کے پتے چلتے ہیں۔ پرسوں تو پورے تھانے کی اس نے دعوت کی تھی۔ چھوٹی کوتوالی کا نکا حوالدار تک ادھر دعوت کھا کے گیا ہے۔ اب تو عمر دین سر سے اوپر اوپر ہی دیکھتا ہے۔ نیچے نگاہ نہیں کرتا۔ جب دیکھو ہندوؤں کا اس کی بیٹھک میں میلا لگا ہے۔ کہتے ہیں یہ کانگرسی بھی بن گیا ہے۔ آریا سماجی' کانگرسی ٹوپیاں پہنے روز شام کو درگاہ کے چار چفیرے منجیاں ڈال کے بیٹھ جاتے ہیں۔ مسجد کا راستہ رک گیا ہے۔ پیشی ویلے میں نے ہمت کی تھی جانے کی۔ لالہ ہری چند ہے نا چوڑے بازار میں جوتیوں کی

دوکان والا ٔہری شوز۔ اس نے کھنگورا مار کے روک لیا مجھے۔ بولا۔

کدھر جی۔

میں نے کہا نماز پڑھنے جا رہا ہوں'

بولا کیوں بانگ سنی ہے؟ مولوی کی؟

میری بات سن کے سارے ہندو ہنسنے لگے۔

ایسے تمسخر سے وہ ہنسے کہ میرا خون کھول گیا۔

دو تو بودیوں والے برہمن تھے۔ ایک اپنی گلی کی پرچون والا لالہ دھیلے پال' وہ پوپلا سا منہ بنا کے۔ بڑی حقارت سے آواز بدل کے گیدڑ کی طرح بولا۔

ادھر کیا کرنا تھا مولوی نے رہ کے' میت کا رستہ تو ہے نہیں کوئی۔

کیوں یہ رستہ ہی تو ہے' سارا میدان۔ میں نے کہہ دیا۔

انہوں نے پھر نخوت سے بولنا شروع کر دیا۔ ایک نے اونچی آواز میں عمر دین کو آواز دی'

او چوہدری

عمر دین اپنی بیٹھک سے شربت کا جگ اٹھائے نکلا۔ بولا ہاں لالہ جی۔

لالہ دھیلے پال بولا' عمر دین تو نے محلے والوں کو بتایا نہیں۔ اب یہ جگہ تو نے بیچ دی ہے۔

پتہ ہے جی۔ عمر دین بولا'

یہ بھی بتا دے کہ اب ادھر ہم نے دیواریں کھڑی کرنی ہیں۔

کمرے بنانے ہیں۔ دوکانیں کھولنی ہیں۔

آپ کی جگہ ہے جی۔ جو مرضی آئے کریں۔

لو شربت پئیں۔

وہ پھر ہنسنے لگے۔

ان کی ہنسی اب بھی یاد آتی ہے تو روئیں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بازوؤں پر۔
خون کھولتا ہے۔ چوہدری تو اگر ہوتا نہ میری جگہ۔ تو ان کا خون پی جاتا۔
رانجھا بیٹھا غصے سے ہاتھ ملتا رہا۔ بولا تاریخ اگلی پہلی کی ہے عدالت میں۔ دعا کرو۔ انصاف مل جائے۔
وکیل تیرا کون ہے؟
اپنا وکیل تو کچا ہی ہے۔ چوک بڈھے دریا کے تیلیوں کا بیٹا ہے نا' نیا نیا وکالت پڑھ کے آیا ہے' ہے مسلمان۔ لیکن استاد اس کا' بڑا وکیل ہے۔ دیکھ ہندو کتنے سیانے ہیں جس بڑے وکیل سے ہمارا وکیل وکالت سیکھتا ہے' اسے ہندوؤں نے اپنا وکیل بنا لیا ہے۔
جج کون ہے؟ ایک نے پوچھا۔
وہ تو ہندو ہی ہے۔ رانجھے کی آواز مری ہوئی تھی۔
تب تو چوہدری مقدمہ گیا اپنے ہاتھ سے۔
کیوں' ڈیڑھ سو سال سے دھرم سالہ کی جگہ ہے۔ درگاہ کی جگہ ہے' مسجد کا راستہ ہے۔ تم محلے والوں کے استعمال میں ہے وہ جگہ۔ پھر بھی انصاف نہیں ہوگا۔
نہیں ہوگا چوہدری۔ دیکھ لینا۔
وہی بات ہوگئی۔ رانجھا مقدمہ ہار گیا۔
ہائی کورٹ لاہور میں اپیل لے گیا۔ جو تھوڑے بہت رانجھے کے پاس پیسے رہ گئے تھے۔ وہ بھی لگا دیئے۔ تاریخیں پڑتی رہیں۔ کام کاج چھوڑ کے رانجھے کو لدھیانے سے لاہور جانا پڑتا۔
مقدمہ لٹکتا رہا۔
بھائی اس کے اس سے خفا تھے۔
محلے دار مسلمان ساتھی غریب۔

باقی اڑوس پڑوس والے ہندو دشمن۔
رانجھا اکیلا رہ گیا۔
اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ کمزور پڑ گیا ہے۔ اس نے پھر کسرت شروع کر دی۔ اکھاڑے میں جانا شروع ہو گیا۔ ڈنڈ پانچ پانچ سو روز پیلنے لگا۔ اسے اتنا یقین تھا کہ ہائی کورٹ جو مرضی فیصلہ دے' عمر دین سے وہ اکیلا نپٹ لے گا۔
عمر دین بھی جانتا تھا کہ رانجھے خان نے اس کی گردن پکڑ لی تو اس کے ہندو ساتھی چھڑا نہ پائیں گے۔ ایک دن رانجھا اپنی بیگم کے ساتھ اپنی تنگ گلی سے چلا آ رہا تھا۔ دو قدم پیچھے اس کی بیگم تھی۔ بیگم نے ٹوپی والا سیدھا برقعہ پہنا ہوا تھا' گود میں بچی تھی' انگلی سے لگا بچہ تھا۔ سامنے سے عمر دین آ گیا۔
رانجھے نے عمر دین کو دیکھا تو کھڑا ہو گیا۔
بیوی بھی سرک کے قریب ہو گئی اور کھسر پھسر میں بولی۔
جھگڑ نہ پڑنا' گھر چلیں۔
رانجھے نے بایاں ہاتھ اٹھا کے اوپر کیا اور دانت پیس کے بولا'
تم گھر جاؤ۔
بچوں کو بھی لے جاؤ۔
اتنے میں عمر دین ہولے ہولے چلتا قریب آ گیا۔ آنکھیں اس نے جھکائی ہوئی تھیں۔ ایک دو بار چوری سے نکلنے لگا تو رانجھے کو دیکھا' رانجھا ٹکٹکی لگائے اسے گھور رہا تھا۔ سامنے آ کے عمر دین پہلو سے نکلنے لگا تو رانجھے نے دائیاں ہاتھ اٹھا کے سیدھا کیا اور بولا۔
ٹھہر جا عمر دین۔
عمر دین رک گیا۔ منہ میں اس کے پان تھا۔ چباتا آ رہا تھا۔
رکا تو جبڑے چلانا بھول گیا۔

پہلے پان کی نکر تھوکنے کے لیے اس نے گردن ہلائی پھر تھوک نگلتے نگلتے پان بھی نگل گیا۔ حلق صاف کر کے بولا۔ سلام علیکم چوہدری۔

سلام چھوڑ عمر دین' اب تو نمستے بولا کر۔

کیوں۔

ہندو میت کا دروازہ بند کرتے تو سمجھ آتی تھی' تو نے مسلمان ہو کے مسلمانوں کی پشت پر وار کیا ہے۔

نہ چوہدری تو سمجھا کر' انہوں نے کانگرسی پارٹی میں محلے کا صدر بنایا ہے مجھے۔

تجھے پھر بھی شرم نہیں آئی! رانجھا بولا۔

شرم کس بات کی' کل کو میں ممبر بن گیا تو مسلمانوں کے ہی کام آؤں گا۔ عمر دین نے کہا۔

مسلمانوں کا کام تو تم نے کر دیا۔ ڈیڑھ سو سال کی درگاہ کی زمین' مسجد کا راستہ' جینے مرنے' خوشی غمی کی سانجھی جگہ تو تم نے بے ایمانی سے بیچ دی۔ اب کیا رہ گیا ہے ادھر مسلمانوں کے پاس۔ تجھے تیرا ضمیر کچھ نہیں کہتا۔ یا وہ بھی مار دیا ہے۔

عمر دین نے نگاہ نیچی کر لی اور پیروں سے گلی کی ایک اکھڑی ہوئی اینٹ کو اپنے داہنے پیر کی چپل کے انگوٹھے سے اکھاڑ کے ہلاتا رہا۔

دیکھ عمر دین' میری آج بات غور سے سن لے۔

رانجھے نے عمر دین کی بانہہ پکڑ لی بائیں' اپنے داہنے ہاتھ میں اور بولا۔

اگر تو ہائی کورٹ سے بھی جیت گیا، تو بھی میں نے نہیں ہارنا۔

تو نے بہتیرے نوٹ جمع کیے ہیں۔ ہندو ساہوکار تیرے یار ہیں، شہر کا بڑا ہندو وکیل تیری طرف سے دلیلیں دیتا ہے۔ دیتا رہے۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ تیرے جثے میں پچیس من کی گائے سے زیادہ جان نہیں ہے۔ عقل چاہے اتنی ہی ہو۔ تجھے پتہ ہو گا۔ دو سال میں نے ایک مکا مارنے کا مقدمہ لڑا تھا۔

پتہ ہے نا۔

یہ بھی یاد رکھنا۔ تو ہندوؤں کا دم چھلا ہے۔ ان کی گائے نہیں ہے۔

کمی تیری کنپٹی پر لگی تو وہ تیری خاطر عدالت میں نہیں جائیں گے۔

ابھی بھی وہ تیری خاطر تیرے یار نہیں بنے۔ وہ تیرے سجن نہیں ہیں۔ مسجد کے دشمن ہیں۔

درگاہ کے ویری ہیں۔

مسلمانوں کے مل بیٹھنے کی جگہ نہیں وہ کوئی رہنے دینا چاہتے۔

انہیں ادھر اپنی دوکانیں بنانی ہیں۔

پیسہ کمانا ہے۔

تو ٹھنڈے دل سے سوچ۔

ایک بار انسان بن کے سوچ۔

مسلمان بن کے سوچنے کی توفیق نہیں ہوتی نہ سہی۔

تو اس بات سے خوش ہے کہ انہوں نے ہیرا پھیری سے جعلی کاغذ تم سے بنوا کے، مسلمان محلے کی جگہ تم سے خرید لی اور بتی والی گلی کے چوک کا نام تیرے نام پر رکھ دیا۔ عمر دین چوک کہنا شروع ہو گئے اسے۔ بس اتنی بات سے خوش ہو گیا۔ چار پیسے جعل سازی سے کما لیے، اسی سے سرمست ہو گیا۔

ڈر اپنے انجام سے۔

یہ پیسے سپولیے بن کے تمہیں ڈسیں گے۔ تو نے کسی دن ادھر سے جانا ہے۔ کمی نہ بھی لگی تو بھی جانا ہے۔ پھر یہ تیرے ہندو یار، یہ کانگریسے، آریہ سماجیے یہ تیرے جنازہ پڑھنے تو نہیں آئیں گے۔

تو نے تو اپنے جنازے کی جگہ بھی بیچ دی' بے شرم۔

کون پڑھے گا دو بول تیرے مرنے کے بعد۔

تھا مجھے۔

رانجھا اس کا بازو پکڑ کے جھنجھوڑنے لگا۔

ایک دو جھٹکے دیئے تو عمردین کا بازو، بغل کے جوڑ سے چٹخنے لگا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنا بائیاں کندھا پکڑ لیا۔ گلی میں چلتے آتے، دو چار آدمی کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے رانجھے کو تھپکیاں دے کے سمجھانا شروع کر دیا۔

چھوڑے پہلوان، تیرے جوڑ کا نہیں ہے۔

مجھے پتہ ہے میرے جوڑ کا نہیں ہے۔

اسے سمجھا۔

اسے سمجھ نہیں آئی۔ اس بات کی۔

یہی ہتھ جوڑی کرتا ہے۔ مقدمے چلاتا ہے۔

سمجھاؤ اسے۔

گلی کے لوگ پکڑ دکڑ کے دنوں کو دور ہٹا لے گئے۔ رانجھے کو فضل الٰہی سمیت اس کے پڑوسی اس کے گھر تک لائے، گھر کی دہلیز پر رانجھے کی بیوی دو تون بچوں کو لیے پریشان کھڑی تھی۔ ایک سیانا پڑوسی بولا، تو نے رانجھے' کڑی کو بھی پریشان کیا ہے۔ جا اندر جا کے بیٹھ۔ خیال رکھا کر کڑیے رانجھے کا۔ رانجھے کی بیوی برقعہ ہاتھوں میں لیے آنکھوں کے آگے بنی جالی میں پروئے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ رانجھا گھر کے اندر گیا تو وہ بھی پیچھے پیچھے چلتی اندر آ گئی۔ برقعہ اتار کے دیوار کے ساتھ لگی گیلے کپڑے سکھانے والی تار پر ڈالا اور جی کھول کے رونے لگی۔ پانچ سال کا بچہ چہرہ اٹھا کے ماں کو روتے دیکھ کے منہ کھول کے رونے لگا۔ گود میں لیٹی بچی بھی دیکھا دیکھی رونے لگی۔ رانجھا گھر آتے ہی غسل خانے میں گھس گیا تھا۔ بیوی اور بچوں کے رونے کی آوازیں سن کے عفریت کی طرح ناک پھلائے، لال لال آنکھیں نکال کے، پھنکارتا ہوا تولیہ ہاتھ میں پکڑے باہر آیا اور غصے سے چیخ کر بولا،

کیوں رونا مچایا۔ مر گیا کوئی؟

تینوں ایک دم سے خاموش ہو گئے۔ بچہ سہم کے وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔ بیوی کھڑی کھڑی سہم کے دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ گود میں پڑی بچی گول گول آنکھیں کھول کے ماں کا چہرہ دیکھنے لگی۔ تھوڑی دیر تک کوئی نہ بولا، تو پھر رونے لگی۔

دودھ پلا اسے۔ بھوکی ہے۔ رانجھا بولا۔

پلاتی ہوں جی۔

رانجھے کی بیوی یہ بول کے دیوار سے لگی کھڑی پیڑھی کو پاؤں مار کے سیدھا کر کے دھڑام سے بیٹھ گئی۔ بچی کو گود میں لے کر اپنے گریبان کے بٹن کھول کے اپنی بائیں چھاتی سے اسے دودھ پلانے لگی۔

دوپٹہ تو اوپر کر لیا کر لشکارے ضرور مارنے ہیں۔

رانجھا ٹکٹکی لگا کر بیوی کے گریبان کے نیچے ابھرے ہوئے سفید سفید جسم کو دیکھتے ہوئے لہجہ بدل کے بولا۔

بیوی آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے بسورتے بسورتے ایک دم سے ہونٹ کھینچ کے مسکرانے لگی اور آنکھوں میں ستارے بھر کے رانجھے کی طرف دیکھ کے موٹے موٹے آنسو گالوں پر گرانے لگی۔ پاس کھڑا بچہ ایک نظر اپنے باپ کو دیکھ کے ماں کی گردن میں بازو ڈال کے کھڑا ہو گیا اور رونے جیسی شکل بنا کے مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔ رانجھا تولیہ اپنے کندھے پر رکھ کے دھوتی کو پنڈلیوں سے اوپر کھینچ کے، بیوی کے سامنے بیٹھ گیا۔

ایک ہاتھ بیوی کے سر پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے بچے کے گال تھپتھپانے لگا۔ رانجھے کی بیوی کا نام کریم بی بی تھا۔ کریما کہتے تھے سبھی اسے۔ رانجھا کبھی کبھار اسے لاڈ میں کریمے کہہ کے بلاتا تھا۔ بیٹھ کے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا پھیرتا وہ اس کے گالوں پر سرکتے آنسوؤں کو پونچھ کر بولا،

کرمیے۔ روئی کیوں؟

بول!

کریم بی بی نے پھر آنکھوں میں آنسو بھر لیے اور بچی کو گود میں لیے لیے، دودھ پلاتے پلاتے بچی کے اوپر سے اپنا ہاتھ آگے لا کے رانجھے کی کلائی پر اپنا ماتھا ٹکا کے روتے روتے رانجھے کا بازو گیلا کر دیا۔ روتے روتے بولی۔

آپ نے گائے کی کنپٹی والے مکے کی بات کیوں کی تھی۔

رانجھے نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ زیادہ آنسو دیکھ کے اپنے کندھوں سے تولیہ اتار کے بیوی کا چہرے پونچھنے لگا۔ پھر اس کی آنکھوں، بھوؤں، ناک اور بالوں پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتا پھیرتا بولا، خبردار اب ایک بھی آنسو نہیں آنے دینا۔ پھر ایک دم سے ہنستے ہوئے بولا۔

"تجھے اس گائے کا کیوں خیال آ گیا، تیری رشتے دار تھی وہ۔"

کریما بھی ہنس پڑی۔

دیکھ کتنی سوہنی لگتی ہے ہنستی ہوئی۔

پھر رلاتے کیوں ہیں آپ!

مجال ہے کسی کی جو رلائے تمہیں۔

ابھی ڈانٹا نہیں، غصے سے، کیوں رو رہے ہو، کریما نے ہنستے ہوئے رانجھے کی نقل اتاری۔

رو رہے تھے تم لوگ، تو اور کیا کہتا۔ شاباش اور اونچا روؤ، بے سروں۔

کریما کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

اب مزہ آیا، رانجھا اپنی بیوی کو بازوؤں میں لے کر چومنے لگا۔

خیال کرو، بچہ کھڑا ہے۔

بچہ بھی اپنی باری آنے پر یہی کرے گا۔ دیکھنے دو۔

ہٹو۔ بے شرمی ہے۔
اچھا جی، ہٹ گئے۔ رانجھا کھڑا ہو گیا۔
اب نہا لوں۔ رانجھا غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔
ٹھہریں۔ ایک وعدہ کریں، کریما بولی۔
رانجھا رک گیا۔ کیا وعدہ لینا ہے مہارانی نے۔
مہارانی ہوتی تو وعدہ کر کے مکرتے نہیں۔
اب کونسا کبھی مکرا ہوں۔
وعدہ کریں، جو میں کہوں گی، وہ کریں گے۔
اور آج تک کیا کیا ہے، ایک گائے مر گئی ہاتھ سے، اسی کے سب طعنے دیتے ہیں۔
اسی کی بات کرنے لگی ہوں۔
کیا۔ اس کا اب کیا کروں۔
اس کا نہیں، اس طرح کی حرکت نہیں کرنی پھر کبھی۔ کریما بولی۔
میں سمجھا نہیں۔
سب سمجھ گئے ہیں۔
مطلب۔
کوئی بھی ہو، چاہے عمر دین ہو، آپ نے ہاتھ نہیں چلانا کبھی۔
ہاتھ کب چلایا، بات کر رہا تھا۔
بات بھی نہیں کرنی اس طرح۔
کیوں؟
بات بڑھ جاتی ہے۔
بڑھنے دو۔

نہ، بات بڑھے تو ہاتھ چل جاتا ہے۔
ساری عمر کشتیاں کی ہیں۔ ہاتھ ہی تو چلائے ہیں۔
نہ وہ اور بات ہے۔ کشتیاں کریں، کسرت کریں۔ اکھاڑے جائیں نہ جائیں۔
مکا مکی نہیں مارنا کسی کو۔ یہ وعدہ کریں۔ خاص طور پر کنپٹی پر۔
رانجھا ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے بولا، اچھا کسی کے نہیں مارتا پر تیری کنپٹی پر ماروں گا۔
کریما جی کھول کے مسکرائی، بولی، بسم اللہ میری کنپٹی حاضر ہے۔
اوں، میری کریمی کبوتری، ایسے کہتے ہیں۔
رانجھا غسل خانے سے پھر پلٹ آیا اور کریما کے پاس بیٹھ کے اس کی کنپٹیوں سے بال سرکا سرکا کے دونوں طرف باری باری چومنے لگا۔
پھر بے شرمی۔ چلیں جدھر جا رہے تھے۔ ورنہ میں اٹھتی ہوں۔
نہ نہ تو بیٹھی رہ۔ میں جاتا ہوں۔ رانجھا اٹھ کے غسل خانے میں چلا گیا۔ پھر غسل خانے کا دروازہ تھپتھپاتے ہوئے اسے تھوڑا سا کھول کے ہاتھ باہر نکال کے چلایا۔
صابن دے جا۔
آئی۔ کریما بچی کو گود سے اتار کے اندر کمرے میں چارپائی پر لٹا کے بچے کو پاس بٹھا کے بھاگی بھاگی صابن لے کر غسل خانے کے دروازے پر گئی۔ رانجھے کے ہاتھ میں صابن رکھا، تو رانجھے نے صابن گرا کے کریما کا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک ہی جھٹکے سے اسے غسل خانے کے اندر کھینچ لیا۔
رانجھے کو کریما سے بڑا پیار تھا۔
گھر میں چین تھا۔ رانجھے کا کاروبار ہلکا تھا۔ جو تھوڑا بہت کماتا وہ مقدمے کی نذر ہو جاتا۔ بھائیوں سے وہ ابھی تک خفا تھا۔ انہوں نے بھی توجہ نہیں دی۔ انہیں پتہ تھا ان دنوں رانجھے نے مقدمے میں سینگ پھنسائے ہیں۔ دیوانی مقدمہ ہے۔ سال ہا سال چلے گا۔ اچھا ہے نہیں ملتا۔ رانجھا بھی انکھ والا تھا۔ میں کیا اس لیے ملنے جاؤں کہ

وہ سمجھیں مقدمے سے تھک گیا ہے۔ امداد مانگنے آیا ہے۔

کریمانے گھر سنبھالا ہوا تھا۔

پتلی سی تھی۔ گوری چٹی۔ نازک سی۔ چولہے کے پاس لکڑیاں جلانے بیٹھتی تو دھویں سے کملانے لگتی۔ آنکھوں سے نیر بہنے لگتے۔ ہاتھوں میں آٹے کا پیڑا لے کر تھپتھپاتی تو روٹی پیک کے پراٹھے کا ذائقہ دیتی۔ رانجھا اس کے پاس بیٹھ کے نوالے توڑتا تو کہتا جاتا' تو گھی ملاتی ہے روٹی میں۔

کدھر ملاتی ہوں۔

مجھے پتہ ہے کدھر ہے گھی تیرا۔

بے شرمی والی باتیں نہ کیا کریں۔

پھر کونسی باتیں کیا کروں۔

ہاں' اور باتیں تو آپ کو آتی نہیں۔ بے شرمی آتی ہیں یا پھر کشتی کرنی۔

تو بے شرمی نہیں کرتے چل کشتی کرتے ہیں۔ رانجھا توڑا ہوا لقمہ چنگیر میں رکھ کے اٹھنے لگتا۔ کریما' ایک دم گٹھڑی سی بن کے چولہے کے ساتھ جڑ جاتی اور چولہے کے پاس پڑے چمٹے کو اٹھا کے رانجھے کے پیر کے پاس چھن کر کے مارتی۔

رانجھا اچھل کے دونوں پیروں پہ بیٹھا بیٹھا پھدکتا اور ہنستا۔

تو اب کھالوں؟ رانجھا پھر لقمہ اٹھا کے منہ میں رکھ لیتا۔

بول نا

وہ کھاتے کھاتے بولتا۔

کھاتے ہوئے تو نہ بولا کریں۔

ابھی کھایا کب ہے۔ کھالوں۔

پھر۔ نکالوں چمٹا۔

دونوں ہنسنے لگتے۔

ہنستے کھیلتے اچانک ایک دن کریما بیمار ہوگئی۔ پہلے دھڑا دھڑ اسے پورا دن الٹیاں آئیں۔ پھر پیچش شروع ہو گئے۔ شام تک وہ نچڑ کے بستر پر لگ گئی۔ رانجھا پاگلوں کی طرح حکیموں ویدوں کے چکر لگاتا رہا۔ صبح ہونے سے پہلے وہ مر گئی۔ رانجھا کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گر گیا۔ بے سرت ہو گیا۔ اس کے بھائی' رشتے دار' برادری کے سب لوگ پھر اکٹھے ہو گئے۔

رانجھے کی دنیا اندھیر ہوگئی۔

بچے اس کے اس کی بھرجائی لے گئی۔ اسی نے رانجھے کو پالا تھا۔ وہی رانجھے کی سالی بھی تھی۔ رانجھا اکیلا بے حد اکیلا ہو گیا۔ مقدمہ چلتا رہا۔ اس کا دل ہر طرف سے اچاٹ ہو گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ قدرت استاد بنی، اپنے خلیفہ سے پھر اس کی ہتھ جوڑی کرا رہی ہے۔ دشمن ٹھسی مار کے گرانے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ اسے اکھاڑے میں سیکھا ہوا استاد کا ایک سبق یاد آ گیا۔

یاد رکھنا'

جب بھی تو نے دونوں پیر اکٹھے کر کے ڈھیلے کیے تو سامنے والا تجھے ٹھسی مارے گا اور تو چاروں شانے چت گرے گا۔ بچنا ہے تو پاؤں زمین پر ڈھیلے نہ کرنا۔ ٹھسی کا اندیشہ ہو تو چالاکی سے سامنے نظر رکھنا۔ ادھر حریف کے پاؤں میں حرکت ہو تو فوراً اسی کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کے' جست بھرنا۔ دونوں پاؤں اٹھا کے ایک لمحے کو اوپر کرنا۔ پھر دیکھنا' ٹھسی مارنے والا خود ہی گرے گا اور تو اس کے اوپر ہو گا۔

رانجھے نے دونوں پاؤں مضبوطی سے زمین پر رکھ لیے اور حالات سے کشتی کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

تمہیں یہ ساری باتیں۔ اس لیے تفصیل سے بتا رہا ہوں کہ رانجھا میرا نانا تھا۔ مگر مرنے والی کریما میری نانی نہیں تھی۔

میری نانی ارجمند بانو اس وقت لدھیانے سے نو میل پیچھے ابوالفضل کے ہیڈ مان

پور سے ڈھائی میل پرے دوراہا ریلوے اسٹیشن پہ دہلی سے آنے والی طوفان میل ایکسپریس کے تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں اپنی چھ سال کی یتیم بیٹی کو گود میں سلائے اپنی ماں چاند بیگم کے کندھے سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھی۔ دونوں ماں بیٹی ریل کے باتھ روم کی باہر والی دیوار کے ساتھ فرش راستے میں بادامی رنگ کی کلیجی دھاریوں والی بستر کی چادر بچھائے اپنی دو گٹھڑیوں اور تین ٹرنکیوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ سمٹ سمٹا کے پرکٹی مرغیوں کی طرح۔ وہ کچھ ایسے سہمی اور ڈری بیٹھی تھیں جیسے گاڑی میں ہر چڑھنے والا ان کی ٹرنکی یا گٹھڑی اٹھانے کے لیے ان کے ڈبے میں چڑھا ہے۔ دہلی سے دوراہے تک ساری راہ ارجمند بانو کی ماں نے آنکھ نہیں بند کی تھی۔ اس کے لیے لدھیانے کا مفہوم چوہدری غلام محمد تھا۔ رانجھے کا سب سے بڑا بھائی۔ جو چوڑے بازار میں کپڑے کا لاکھ پتی مغرور، کنجوس اور کٹھور دل بیوپاری تھا۔ جس کے نام چاند بیگم کے مرحوم شوہر کے چھوڑے ہوئے ایک رجسٹر میں ٹھپا سازی کے کچھ روپے واجب الادا تھے۔ بظاہر انہی لکھے پیسوں میں اس لٹے پٹے غریب الوطن خانوادے کا مستقبل تھا۔ مگر وقت کے رجسٹر میں چوہدری غلام محمد کا خاندان کہیں زیادہ ان ستائی ہوئی عورتوں کا نادہندہ تھا۔ اس لیے کہ غلام محمد کے پورے کنبے کا سب سے ہتھ چھوڑ، دریدہ دہن، سڈول خوش شکل اور غصیلا شخص، رانجھا' ارجمند بانو کے پورے کنبے کا کفیل لکھا جا چکا تھا۔

وقت کی کتاب کے اگلے صفحوں میں ارجمند بانو کی شادی رانجھے سے طے تھی اور ارجمند بانو دہلی سے لدھیانے کے اس سفر میں بے خبر تھکی اونگھ رہی تھی۔ اس کے دونوں چھوٹے بھائی اکرم اور باقر بھی ارجمند بانو کے پاس ہی گٹھڑیاں سی بن کے سو گئے تھے۔ ارجمند بانو کی ماں کی کھلی آنکھوں کے پہرے کے لیے اب گٹھڑیوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ وہ پاس کھڑے بیٹھے مسافروں سے ہر اسٹیشن یہ پوچھتی تھی، بھائی لدھیانہ شہر کتنی دور ہے۔

دور ا ہے جنکشن پہ لدھیانے کا فاصلہ صرف نو میل سن کے چاند بیگم کے جی میں آیا
کہ اپنا بائیاں کندھا ہلا کے، ارجمند بانو کی نیند میں ڈھلکی گردن کو ہاتھوں میں سہار کے'
کہے، بیٹی اٹھیے، لدھیانہ نو میل رہ گیا۔ ریل کا نٹا بدل رہی ہے۔
اسے اس سے یہ تھوڑی پتہ تھا کہ ارجمند بانو کی ہتھیلی پہ قسمت کی لکیریں بھی کا نٹا
بدل کے پٹریاں بدلنے والی ہیں۔
تجھے بھی اسی لیے خبر نہیں ہے کہ نو میل پرے آنے والا اسٹیشن کبھی کبھار آتے
وقتوں کے نواسے نواسیوں کے نانا اور نانی بدل دیتے ہیں۔ تو ابھی تک یہی سمجھے بیٹھی
ہے کہ تیری ڈھائی سالہ بیٹی کا باپ ہی تیرے سارے نواسے نواسیوں کا نانا ہو گا۔
آنے والے وقت پہ ایسا اندھا اعتبار بڑا بے اعتبارا ہے۔
جی میری جان۔
وقت سے بڑا شاہ زور کوئی نہیں۔
بڑے بڑے زور آوروں کے زور وقت کے سامنے زیر ہو گئے۔
تراشے ہوئے پہاڑوں سے بنے محل اور قلعے ریت میں ڈوب گئے۔
خوابوں سے سجائی کہکشا ہیں وقت کی دھند اور دھوئیں میں گم ہو گئیں۔
وقت سے بڑا پہلوان کون ہے؟
ارجمند بانو کے سامنے تو اس کی آنے والی زندگی میں دو پہلوان کھڑے تھے۔
دوسرا پہلوان رانجھا تھا۔
تجھے ابھی تک اس پہلوان کے نواسے کی سمجھ نہیں آئی؟
حیرت ہے!
تو نے میرے دادا کو دیکھ کے بھی مجھے نہیں دیکھا۔
نانا، نانی کی کہانی سن کے بھی اس حیرت کدہ دنیا کے اکھاڑے کو نہیں سمجھا تو میں
کیا کروں۔

تجھے سمجھانے کے بلاؤں۔

اب تو کہانی میں ایک بابے کے بلاوے کا سے آ گیا ہے۔ لگتا ہے تجھے بھی میرے بلاوے تک میری سمجھ نہیں آنی۔

اچھا ہے۔ کیونکہ ہوتا یہی آیا ہے، جس کی سمجھ کسی کو آ جائے، اوپر سے اس کا بلاوا آ جاتا ہے۔

□

سنجوگ

ارجمند بانو کی بوڑھی ماں نے تین چار دنوں میں، لدھیانہ شہر کے اندر چوہدری غلام محمد کو تلاش کر لیا۔ وہ مشہور آدمی تھا۔ امیر کبیر بندہ تھا۔ کپڑے کی بڑی مارکیٹ میں ہر دکاندار اس سے آگاہ تھا۔ ارجمند بانو کی ماں نے پہلے دو تین دن تو شہر میں ایک چھوٹا سا کرایے پر مکان ڈھونڈا۔ جب رہنے کی سبیل ہو گئی تو اپنے مرحوم شوہر کے حساب کتاب والا رجسٹر بغل میں لے کر چوہدری غلام محمد کو ڈھونڈنے نکلی۔ وہ اسی دن مل گیا۔ ارجمند بانو کی ماں نے اس سے ساری کہانی کہہ کے رجسٹر پہ لکھی تحریر اس کے سامنے رکھ دی۔ چوہدری غلام محمد بڑا آدمی تھا۔ ہر بڑے آدمی کی طرح اس کے پاس لمبی تفصیلات میں الجھنے کا وقت نہیں تھا۔ سرسری طور پر رجسٹر پہ نگاہ ڈال کے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور بولا، ہاں جی، لال خاں سے مدتوں کاروبار رہا ہے۔ بڑا بھروسے کا آدمی تھا۔ اس کی وفات کا سن کے بڑا افسوس ہوا۔

اب کدھر ٹھہری ہیں آپ؟

جی، رائے بہادر روڈ کے پاس بتی والے چوک میں ایک گھر کرایے پہ لیا ہے۔

وہ جگہ تو اپنی دیکھی بھالی ہے، ادھر کس سے گھر لیا ہے کرایے پہ، ہندو سے یا مسلمان سے؟

جی، مسلمان ہیں وہ۔ نام بھی عمر دین ہے ان کا مگر ہیں وہ کانگریسی۔ ہندوؤں کے ساتھ ہی ان کا اُٹھنا بیٹھنا ہے۔ زیادہ تفصیل تو ہم جانتے نہیں ابھی چار دن ہی تو ہوئے ہیں ہمیں ادھر۔

عمر دین تو ہمارا اپنا بندہ ہے۔ کتنے کرایے پہ بات ہوئی ہے گھر کی؟

جی، نو روپے مہینہ کرایے کا وہ کہتے تھے، اصرار کر کے سات روپے پہ منوایا ہے۔

چلو اچھا ہے، پیشگی کوئی رقم تو نہیں دے دی، زیادہ؟

نہیں جی، بس ایک مہینے کا کرایہ دیا ہے، سات روپے۔

بس ٹھیک ہے، جو دے دیا، سو دے دیا۔ آئندہ ہم خود ان سے لینا دینا کر لیں گے، آپ اطمینان سے رہیں۔ بچے بھی آپ کے ساتھ ہوں گے؟

جی ہاں۔

آپ فکر نہ کریں۔ لال خان سے ہماری تعلق داری تھی۔ آپ کو گھر کا سامان بھی کچھ لینا ہوگا، باورچی خانہ چلانا ہوگا۔ یہ کہہ کے چوہدری غلام محمد نے اپنے منشی کو آواز دے کر پاس بلایا۔ اور اسے کہنے لگا، اس عورت کو ڈیڑھ سو روپے دے کر رسید پہ انگوٹھا لگوا لو۔

منشی ڈیڑھ سو روپے گلے میں سے نکال کے گننا شروع ہو گیا۔

ارجمند بانو کی ماں رجسٹر کھول کے کھلے منہ کے ساتھ چوہدری غلام محمد کو دیکھتی ہوئی ہکلاتی ہوئی بولی، چوہدری جی، رقم تو سات ہزار دو سو روپے ہے۔ یہ ڈیڑھ سو روپیہ لے کر ہم کیا کریں گے۔

میں کونسا مکر رہا ہوں، یہ تو خرچے پانی کے لئے دے رہا ہوں، چلو بھئی (اس نے منشی کی طرف منہ کر کے کہا) پورے دو سو روپے کر دو۔ مائی حساب کتاب کی پکی لگتی ہے۔ پھر ارجمند بانو کی ماں کی طرف رخ کر کے اسے دیکھے بغیر بولا،

جب ختم ہو جائیں تو آ کے اور لے جانا۔

ادھر گھر میں سات ہزار رکھ لئے تو عمر دین نے ڈاکہ ڈلوا دینا ہے۔
پتہ نہیں ابھی آپ کو اس کا۔

یہ کہہ کے چوہدری غلام محمد منہ کھول کے ہنسنے لگا۔ اس کے ساتھ منشی بھی دانت نکال کے کھی کھی کرنے لگا۔ ہنستے ہنستے چوہدری غلام محمد نے جان چھڑانے کے انداز میں ہاتھ ہلایا اور اُٹھ کے دکان کے اندر چلا گیا۔ ارجمند بانو کی ماں منہ کھولے اسے جاتے ہوئے خاموش کھڑی دیکھتی رہی۔ دکان کے اندر گاہکوں کا تانتا بندھا تھا۔ آتے جاتے لوگوں کو سیڑھیوں پہ کھڑی اس بوڑھی عورت کی وجہ سے چڑھنے اترنے میں وقت ہو رہی تھی۔ اپنے کان پہ قلم رکھے منشی نے دو سو روپے گن کے اسے تھمائے اور ایک پرچی پہ انگوٹھا لگوانے کے لئے سیاہی کی دوات ہاتھ میں لے کر سیڑھیوں پہ آ کے بیٹھ گیا۔ ارجمند بانو کی ماں نے پرچی اٹھاتے ہوئے، سیاہی کی دوات کو ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے کہا،

ہم دستخط کریں گے،
قلم لائیے اور منشی کے کان سے قلم کھینچنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔
منشی ایک دم پرے ہٹ گیا۔
ارجمند بانو کی ماں کاغذ دیکھ کے حیران ہو گئی بولی۔
ہائیں، یہ کیا؟
اس کاغذ پہ تو کچھ لکھا ہی نہیں، دستخط کس بات پہ کریں ہم؟
آپ پڑھی لکھی ہیں؟
منشی اپنی عینک کے اوپر سے ہونق چہرہ بنا کے آنکھوں سے دیکھتا ہوا بولا۔
جی، کیوں؟
ایسے ہی پوچھ لیا، کیا لکھوں اس پہ۔
لکھیے، جو دو سو روپے دیے ہیں آپ نے، ساتھ لکھیے سات ہزار باقی واجب

الادا ہیں آپ کی طرف۔ وہ کب ادا ہوں گے ان کی تاریخ بھی لکھ دیجیے۔

منشی نے کاغذ والا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ اور دور کھڑے، مڑ کے ساری بات سنتے ہوئے چوہدری غلام محمد کی طرف دیکھ کے تمسخرانہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا،

چوہدری جی، سنا آپ نے۔ سات ہزار واجب الادا رقم کی تاریخ ادائیگی لکھوا رہی ہیں، بولیے کیا لکھوں!

تو بے وقوف ہے، اپنے بھروسے کے لوگ ہیں یہ،

کس لکھائی پڑھائی میں پڑا ہے تو۔

جائیے جی۔

اگلے مہینے پھر آ جائیے گا۔ اپنوں سے ہم حساب کتاب نہیں کرتے، یہ منشی تو کملا ہے۔ برا نہ مانیے گا۔ یہ کہہ کے غلام محمد دکان کے اندر چلا گیا۔ تین عورتیں سیڑھیوں سے اترنے کے لئے ارجمند بانو کی ماں کے پاس آ کر رک گئیں، دو مرد چڑھنے کے لئے ایک طرف ہوئے کھڑے تھے۔ منشی آہستگی سے ارجمند بانو کی ماں کے پاس آ کے بولا،

ماسی بے فکر رہیں، اگلے مہینے پھر آ جانا۔ یہ ذرا رستہ دے دیں۔

ارجمند بانو سیڑھیوں سے اتر گئی۔ مگر دکان کے سامنے سے نہ ہٹی۔

منشی کچھ دیر دور کھڑا تھوری تھوڑی دیر بعد اسے دیکھتا رہا۔ پھر اندر سے کچھ اشارہ پا کے، دکان سے اتر کے آیا۔ اور ارجمند بانو کی ماں کے پاس آ کر ہمدردانہ انداز میں کندھے جھکا کے اپنے کان ارجمند بانو کے پاس لا کے آہستگی سے بولا۔

آپ کو، کس بات کا خطرہ ہے، کوئی پریشانی ہے ابھی۔

بھائی صاحب، سات ہزار کی رقم ہے۔ ہمارے پاس یہی ایک آخری سہارا رہ گیا ہے۔ پریشانی تو ہو گی۔

چوہدری صاحب نے کہہ دیا ہے نا، آپ کو۔ اگلے مہینے پھر آ جائیے گا۔ دو سو نہ

سہی، کچھ اوپر رقم مل جائے گی۔ مسئلہ کیا ہے!

پورے پیسے مل جاتے، ہم اپنا گھر لے لیتے کوئی، پندرہ سو دو ہزار میں مناسب گھر مل جاتا ہے ادھر۔

چلو، وہ بھی لے لیجیے گا۔ ویسے بھی ابھی آپ نے کونسا کرایہ دینا ہے۔ چوہدری عمر دین تو ہمارے چوہدری صاحب کا دم بھرتا ہے، دن میں دو تین بار ادھر آ کے لسی پانی پیتا ہے۔ شاید ابھی آ جائے۔ اس سے بات ہو جائے گی۔ آپ مطمئن رہیں۔ زیادہ پیسے اکٹھے رکھنا آپ کے لئے خطرے کی بات بھی ہو سکتی ہے۔ زمانہ اچھا نہیں ہے۔ آپ کہتی ہیں چھوٹے چھوٹے بچے ہیں آپ کے۔ پھر کیوں مصیبت اپنے گلے ڈالتی ہیں آپ۔ اور پھر ہمارے پاس ادھر روز کی روزی ہوتی ہے۔ پورے پیسے ایک دن میں تو گلے سے نہیں نکلتے۔ آپ کوئی گھر دیکھ لیں۔ ہزار پندرہ سو والا۔ چوہدری صاحب پیسے چکا دیں گے۔ لکھائی پڑھائی میں جا کے کرا دوں گا خود۔ آپ کہاں عورت ذات کچہری اشٹام کے چکر میں پڑیں گی۔ ٹھیک ہے؟

دیکھ لیں، یہ ہمارے یتیم بچوں کا پیسہ ہے۔ بے سہارا تو ہم ہو ہی گئے ہیں۔ ارجمند بانو کی ماں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس کی آواز کپکپانے لگی۔ وہ اپنے آپ سے کہنے کے انداز میں آہستگی سے زیرِ لب بولی۔ اپنے ہی اپنے نہیں رہے، آپ لوگ تو پھر غیر ہیں۔ بس ایک اللہ ہے، اسی کے سہارے چلتے پھر رہے ہیں۔ کچہری اشٹام کی بات تو آپ نے کر دی۔ ہم سمجھتے ہیں جو آپ کہنا چاہتے ہیں۔ ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ لیکن آپ یہ نہ بھولیے گا کہ اللہ بھی کچہری والا ہے۔ اس کی کوتوالی بہت بڑی ہے۔ اسی کی دہلیز پہ پڑے ہیں ہم۔ ہم سے بے ایمانی نہ کیجیے گا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

نہ جی، بے ایمانی کس نے کرنی ہے۔ منشی اپنی عینک درست کرتے ہوئے تیزی سے بولا۔

چوہدری صاحب کو بھی کہہ دیجیے گا۔

کہہ دوں گا جی، اللہ حافظ۔ یہ کہہ کے منشی تیزی سے دکان پہ چڑھ گیا اور ارجمند بانو کی ماں دوسو روپے دوپٹے کی کنی سے باندھتی ہوئی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی، مڑمڑ کے چوہدری غلام محمد کی دکان کو دیکھتی ہوئی چلنے لگی۔ اس کے مڑمڑ کے دکان دیکھنے اور اس کے آس پاس کی دکانیں دیکھنے کا انداز ایسا تھا، جیسے وہ دیکھ رہی ہو کہیں اگلی بار وہ یہ دکان نہ بھول جائے۔ جیسے اس دکان کی کوئی نشانی یاد کر رہی ہو۔ یا فکروں سے بھرے اپنے سر کو خالی الذہن کرنے کی کوشش میں لگی ہو۔

شہر میں وہ نئی تھی،

راستوں سے ناواقف۔

اپنے گھر کا راستہ بھی کئی بار بھول جاتی تھی۔ پڑھی لکھی تھی۔ دکانوں کے اوپر لکھے بورڈ اور سڑکوں کے نام پڑھ کے چلتی پھرتی رہتی۔ دوسو روپے سے اس نے گھر کے کچھ برتن بھی خرید لئے۔ اس کا باورچی خانہ چل پڑا۔ دونوں بیٹے سمجھدار تھے۔ بڑا پندرہ سال کا تھا، چھوٹا تیرا سال کا۔ اڑوسیوں پڑوسیوں سے بات کر کے دونوں بیٹوں کو ایک ہوزری میں جرابیں بنانے والی لومز کو گھمانے پہ رکھوا دیا۔ وہ بھی ہفتے میں تین چار روپے کمانے لگے۔ ہر مہینے کی تین تاریخ کو وہ چوہدری غلام محمد کی دکان پر جا کے دوسو روپے لے آتی۔ ساتویں مہینے چوہدری غلام محمد نے دوسو روپے کی بجائے ایک سو روپیہ دے دیا اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ اب تمہارا حساب چکتا ہو گیا۔

ارجمند بانو کی ماں کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ یہ کیا بات ہوئی۔

پندرہ سو روپے وصول کیے ہیں آپ سے اب تک۔ وہ بھی کوڑی کوڑی کر کے، سات ہزار دوسو روپے کی رقم تھی۔ ستاون سو باقی بچتے ہیں ابھی۔ آپ کیا بات کر رہے ہیں؟

گھر نہیں لے کے دیا۔

گھر تو کرائے کا ہے۔ بھاڑے کے پیسے پہلے مہینے تو اپنی گرہ سے دیے۔ چھ مہینوں کے بتالیس روپے ہو گئے۔ پندرہ سترہ سو روپے کا تو وہ گھر ہے۔ دو ہزار تو عمر دین اپنے منہ سے مانگتا تھا۔ ہم نے کہا پیسے مل جائیں تو خرید لیں گے۔ دو تین سو کم بھی کروا لیں گے۔ آپ عجیب بات سنا رہے ہیں۔

وہ گھر ہم نے آپ کے لئے لے لیا ہے، عمر دین سے۔ عمر دین نے بتایا نہیں آپ کو۔

کیا مطلب آپ کا؟

گھر کا سودا کر لیا اس سے ہم نے۔ اب آپ رہیں جب تک جی چاہے۔ ہم کرایہ تھوڑی مانگ رہے ہیں آپ سے۔

آپ نے خریدا ہے وہ گھر؟

جی، کیوں کوئی اعتراض ہے۔

نہ جی، مگر اس سے ہمارے پیسوں کا کیا تعلق ہم تو کرایہ دار ہی ہوئے، پہلے عمر دین کے تھے، اب آپ کے ہو گئے۔ آپ اپنا کرایہ کاٹ کے ہمارے بقیہ پیسے ہمیں دے دیں۔

آپ پیسوں کی رٹ لگا کے بیٹھی ہیں، ہم نے آپ کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی خاطر پورا گھر لے کے دے دیا ہے آپ کو۔

او منشی

لا، گھر کے کاغذ، دکھا بڑھیا کو۔

ابھی پرسوں ہی تو سودا ہوا ہے۔ پورے اٹھارہ سو میں۔ آپ سے دو ہزار سے کم میں وہ سودا نہ کرتا۔ دو ہزار میں بھی کیسے کرتا۔ آپ کے پاس اتنے پیسے کدھر تھے۔

اسی لئے تو ہم سات مہینوں سے آپ کے پاس چکر کاٹ رہے ہیں۔ ہمارے پیسے ادا کیجیے۔ ہم اپنا انتظام کر لیں گے۔ وہ گھر آپ کا ہو یا عمر دین کا۔ اس سے ہمیں

کوئی سروکار نہیں۔ ہمیں اپنی رقم چاہیے۔

ارجمند بانو کی ماں کھری کھری سنانے لگی۔

تھوڑی دیر تک چوہدری غلام محمد خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کے چہرے بشرے پہ غصے کی لہر آئی اور اس کا چہرہ کسی بدخیالی سے کالا سیاہ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے پیچھے شیطان ناچنے لگے۔ اور وہ ہاتھ لہرا کے بوڑھی عورت کو خاموش کرتے ہوئے بولا،

مائی سات مہینے سے تمہاری باتیں سن رہا ہوں۔

دو دو سو کر کے خرچہ پانی بھی دے رہا ہوں۔

مجھ سے کوئی اشٹام لکھوایا ہوا ہے، جو رعب دے رہی ہو۔

سات ہزار دو سو روپے کا اندراج تمہارے رجسٹر میں تمہارے میاں نے اپنے ہاتھ سے کیا تھا۔ وہ سات ہزار کی جگہ سات لاکھ لکھ دیتا تو تم وہ چٹی ہم پہ ڈال دیتی۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ ہم نے تمہارے میاں کے پیسے دینے ہیں۔ وہ تو شکر کرو، ہمیں تم جیسے غریب مسکینوں کو پالنے کی خدا نے توفیق دی ہوئی ہے۔ اس لئے تمہیں خرچ دیتے رہے۔ بہتیرا اس میں سے بھی بچا کے رکھا ہوگا۔ اب بہت ہو گیا۔ میں نیکی کر رہا ہوں۔ کہہ رہا ہوں۔ اطمینان سے جب تک اس گھر میں رہنا ہے رہو۔ کرایہ بھی نہ دو چاہے اور آٹھ دس مہینے۔ اب تمہارے بیٹے کماتے ہیں۔ اپنا گھر چلاؤ۔ یہ کیا رجسٹر اٹھا کے ہر مہینے سرکاری اہل کار بنی آوارد ہوتی ہو۔ بتیری ہو گئی نیکی۔ اب جاؤ جس کو توالی سے سپاہی ملتے ہیں لے آؤ۔ ادھر سے تمہیں کچھ نہیں ملنے کا۔ سنا تم نے۔

اب جاؤ۔

ارجمند بانو کی ماں نے پتھرائی ہوئی نظروں سے چوہدری غلام محمد کو دیکھا۔ کتنی دیر اسی طرح دیکھتی رہی۔ اسے غلام محمد کے چہرے میں اپنے ظالم دیور کالے خان کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کے پیروں تلے زمین ہل گئی۔

وہ سہم گئی۔

بولی ایک لفظ نہیں،

چپ چاپ اپنی آنکھیں پونچھتی ہوئی اس دکان کی سیڑھیوں سے اتری اور گھر کی طرف چل پڑی۔ اس کی آنکھوں کے آگے خون کا لال رنگ اترا ہوا تھا۔ سارا رستہ لال لال نظر آ رہا تھا۔ وہ آنسو روکے ہوئے لال خان کو یاد کرتی ہوئی ایسے چلی جا رہی تھی، جیسے اسے آج لال خان کے مرنے کی خبر ملی ہو۔

کئی دن تک ارجمند بانو کے گھر میں خاموش سوگ پلتا رہا۔

سات مہینوں میں اس محلے میں رہتے ہوئے اپنے اڑوس پڑوس سے بھی انہیں کچھ شناسائی ہو گئی تھی۔ ایک دو ساتھ والے پڑوسی بھلے لوگ تھے۔ اس زمانے میں اڑوس پڑوس کی عورتیں ڈیوڑھیوں میں پیڑھیاں ڈال کے بیٹھ جاتیں تو دونوں میں ایک دوسرے کی پچھلی تین نسلوں سے آگاہ ہو جاتی تھیں۔ ارجمند بانو کی پڑوسی خواتین اس لٹے پٹے گھرانے کی ساری کہانی سن چکی تھیں۔ چوہدری غلام محمد اور عمر دین کی شیطانی شہرت بھی انہوں نے ارجمند بانو کی ماں کو کہہ دی تھی۔ عمر دین نے جس طرح مسلمانوں کا اجتماعی احاطہ، مسجد اور دربار شریف سے منسلک زمین ہیرا پھیری سے ہندوؤں کے ہاتھ بیچی تھی اس سے ارجمند بانو کے پڑوس کے مسلمان گھر سہمے ہوئے تھے۔ عمر دین اور رانجھے خاں پہلوان میں جو سال ہا سال سے اسی زمین کا مقدمہ چلا آ رہا تھا اس کی کہانی بھی انہوں نے ارجمند بانو اور اس کی ماں سے کہی ہوگی۔ یہ بھی غالب امکان ہے کہ انہوں نے چوہدری غلام محمد اور رانجھے خان کا باہمی رشتہ بھی بتا دیا ہوگا کہ دونوں سگے بھائی ہیں مگر ہیں ایسے جیسے مقناطیس کے دو اُلٹے رخ۔

اس محلے میں تھوڑے سے مسلمان گھرانوں کی ساری قوت رانجھا تھا۔

رانجھے کی وجہ سے انہیں ابھی تک ہندوؤں اور ہندوؤں کے ساتھی عمر دین سے آنکھ ملا کے بات کرنے کا حوصلہ تھا۔ رانجھے خان نے ہائی کورٹ سے مسلمانوں کے احاطے کے لئے سٹے لیا ہوا تھا۔ اس پہ تاریخیں پڑتی تھیں۔ دونوں طرف سے فریق

ٹولیاں بنا کے لاہور جاتے تھے۔ اور اگلی پیشی کی تاریخ لے کر آ جاتے تھے۔

معاملہ ابھی تک حل نہیں ہوا تھا۔

محلے میں دونوں سینگ پھنسائے ہوئے بیلوں کی طرح رہتے تھے۔

رانجھے کا مزاج سامنے سے آ کے ٹکر مارنے والے بیل جیسا تھا اور عمر دین کنی کترا کے نکل جانے والے بچھڑے کی طرح محلے میں بچتا پھرتا تھا۔ عمر دین کی خوش نصیبی یہ تھی کہ رانجھے خان کا گھر اس کے پچھواڑے میں تھا سامنے یا بغل میں نہیں تھا۔ اس لئے رانجھے خان سے اس کا سامنا کبھی کبھار ہوتا تھا اس کے گھر کے ایک حصے کی پچھلی دیوار رانجھے خان کے گھر سے سانجھی تھی۔ اسی دیوار سے وہ خوف زدہ رہتا تھا۔ جیسے رانجھا رات کو سن لگا کے، دیوار توڑ کے اس کی گردن مروڑنے نہ آ جائے۔ شاید اسی لئے اس نے رانجھے خان کے پچھواڑے میں اپنے گھر کا آدھا حصہ الگ کر کے تین کمروں کا ایک علیحدہ مکان بنا کے کرائے پہ چڑھا دیا تھا۔

کرایہ دار اسے ارجمند بانو کا کنبہ مل گیا۔

ارجمند بانو نے سنا تھا کہ ان لوگوں کے اس گھر میں آنے سے پہلے اکثر رانجھا پہلوان رات کو چھت پہ چارپائی ڈال کے سونے آ جاتا تھا اور صبح صبح اٹھ کے عمر دین کے گھر کی طرف والی اپنی دیوار پکڑ کے پانچ پانچ سو بیٹھکیں نکالتا۔ تین تین سو ڈمر پیلتا۔ اس دوران، عمر دین اپنی چھت پہ بنے پیشاب خانے میں پیشاب کرنے بھی نہ چڑھتا تھا۔ مگر جب سے رانجھے نے دیکھا اس طرف کوئی اور گھرانہ آ گیا ہے۔ جہاں پردہ دار خواتین ہیں، رانجھے خان نے چھت پہ سونا اور صبح کی ورزش اُدھر کرنا چھوڑ دی۔ دونوں گھروں کی چھتوں میں بس ایک ساڑھے چار فٹ کی دیوار حائل تھی۔ رانجھے خان کا سوا دس سال کا بیٹا اور پونے نو سال کی بیٹی کبھی کبھار چھت پہ آتے تو ارجمند بانو کی ان سے باتیں ہو جاتیں۔ ارجمند بانو کے چھوٹے بھائیوں سے بھی رانجھے خان کے بیٹے علی احمد کی دوستی ہو گئی تھی۔ کبھی کبھار وہ دیوار پھلانگ کے ایک دوسرے سے گپیں

لگانے اور پتنگ بازی کرنے ایک چھت سے دوسری چھت پہ بھی چلے جاتے تھے۔ مگر چونکہ علی احمد سکول میں پڑھتا تھا جب کہ ارجمند بانو کے دونوں بھائی لدھیانہ ہوزری میں کام کرتے تھے۔ اس لئے ان کی چھت پہ ملاقات اکثر شام سے ہوتی تھی۔ ارجمند بانو کی اپنی بیٹی اکبری ساڑھے چھ سال کی تھی، جو رانجھے خان کی بیٹی ممتاز کو کبھی کبھار چھت پہ دیکھ کے اپنی دیوار کی اینٹوں میں پاؤں پھنسا کے سر اوپر اٹھا کے باتیں کر لیتی تھی۔ رانجھے خان کے بچوں کو ارجمند بانو کے بھائیوں اور بیٹی سے باتیں کر کے شاید اس لئے مزہ آتا تھا کہ وہ خود پنجابی میں بولتے تھے اور ارجمند بانو کے بھائی اور اس کی بیٹی اردو میں باتیں کرتے تھے۔ انہیں اردو سننے میں مزہ آتا تھا۔ جیسے تھیٹر میں کھڑے چمکتی ہوئی باتیں سن رہے ہوں۔ ان سے سنی ہوئی مزے مزے کی باتیں وہ اپنے ابو کو بھی سناتے رہتے تھے۔ رانجھے خاں کے لئے یہ کسی حد تک اطمینان کی بات تھی کہ عمر دین اس کے پچھواڑے سے نکل گیا ہے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کشتی لڑتے لڑتے، اس کا حریف اس کے پیچھے سے نکل کے بغل میں آ گیا ہو۔ رانجھے خان کی بیوی کو فوت ہوئے پانچ سال سے اوپر عرصہ ہو گیا تھا۔ اس کی بیٹی ممتاز گھر کا کچھ کام کاج کر لیتی۔ ایک سیانی عمر کی آیہ بھی رانجھے نے رکھ چھوڑی تھی۔ شیداں نام تھا اس کا۔ عمر کی پچاس پچپن کی تھی۔ تھی موٹی اور سانولے رنگ کی۔ داہنی ٹانگ انگلی بھر چھوٹی تھی۔ لنگڑا کے چلتی تھی۔ کام کاج میں سست اور باتوں میں تیز تھی۔ اس نے گھر کا نظام سنبھالا ہوا تھا۔
وہ اکثر رانجھے خان کو کہتی رہتی،

بیٹا پہلوان، دوسری شادی کر لو۔

کب تک دیوار پکڑ کے اٹھک بیٹھک کرتے رہو گے۔

ماسی ورزش تو کریما کے ہوتے ہوئے بھی کرتا تھا۔

بھلے کرو، اپنے بچوں کا تو سوچو۔

بچوں کا ہی تو سوچتا ہوں۔ سیانے ہیں۔ دوسری عورت آ گئی تو ان کی ماں کہاں

بنے گی۔

بنے گی۔

کیوں۔ تجھے غیبی خبریں آتی ہیں۔

غیبی خبریں کیوں لینی ہیں، آنکھیں کھول کے تمہاری بھولاؤں گی۔

آنکھیں کھول کے کیا، چراغ لے کر بھی کریما جیسی نہیں ملنی، ماسی۔

چلو، کریما جیسی نہ سہی، اس سے سندر اور سوشیل مل جائے تو پھر!

کیوں، میں تھیٹر کا ہیرو ہوں۔ وہ بڑا بھائی ہے شہاب۔ جس پہ سندریاں مرتی ہیں۔ اب کئی سال سے بمبئی میں بیمار پڑا ہے۔ اس کی پریاں بھی سنا ہے اک اک کر کے، اس کے پاس سے اڑ گئیں۔ ہفتہ ہسپتال میں رہتا ہے۔ دو ہفتے شراب خانے میں۔ وہاں بھی نہیں جایا گیا۔ پتہ نہیں کیا سوچے گا۔ دوسرے بھائیوں کو تو اس کا خیال ہے نہیں۔ میں بچوں کو چھوڑ کے اب کیسے جاؤں۔

اسی لئے کہتی ہوں۔ اپنا گھر بسا لے۔ بہتیرا جوگ کاٹ لیا۔ تمہارے بھائیوں بھرجائیوں نے تیرا نہیں سوچنا۔

مجھے ضرورت بھی نہیں ہے، ان کی سوچوں کی۔

تو پھر مانتا کیوں نہیں میری بات، میں تیری ماں سمان ہوں۔

ماسی، صبح دکان پہ جاتا ہوں۔ شام سے آتا ہوں۔ پھر مہینے میں ایک دو بار لاہور کی پیشی الگ ہوتی ہے۔ اتنے جنجال ہیں پہلے ہی۔ کئی برس ہو گئے ہیں عمر دین کے مقدمے سے جان نہیں چھوٹی۔ پہلے ڈھائی تین برس گائے مارنے پہ کچہری کے چکر لگاتا رہا۔ اس عمر دین نے بھی لگتا ہے گائے کی طرح مرنا ہے، میری کلی سے۔ تم کہتی ہو تیسرا مقدمہ شروع کرلوں۔ دوسری شادی کرلوں۔ مجھ سے نہیں ہوتا اب یہ سب۔ بس علی احمد اور ممتاز پل جائیں، کافی ہے۔

اللہ پالے گا۔

تو بس اسے پالنے دے۔ دوسری عورت کی بات کیوں کرتی ہو۔

تُو، تو پہلوان ہے۔ تیرے جیسے چار چار زنانیاں رکھتے ہیں۔ ایک عمر دین سے ہتھ جوڑی میں تو بھرم چار یا ہو گیا۔

عمر دین کا نام سن کے رانجھے کے ماتھے پہ بل بن جاتے۔ آنکھوں میں شعلے ناچنے لگتے۔ وہ کھانا کھاتے کھاتے لقمہ چنگیر میں رکھ دیتا اور غصے سے روٹی پکاتی آپا کو گھور کے کہتا،

دیکھ ماسی۔

عمر دین کا طعنہ دیا تو اس کی ٹانگیں توڑ کے تیری طرح کر دوں گا۔

پھر وہ بھی تیری طرح داہنے گھٹنے پہ ہاتھ رکھ کے اٹھے گا۔

ٹک ٹک کر کے اونچا نیچا ہو کے چلے گا،

لہرا لہرا کے

جیسے تو چلتی ہے۔

یہ کہہ کے رانجھے کا غصہ بھرا چہرہ مسکرانے لگا۔

سنا تم نے۔

شیداں روٹی پکاتے پکاتے ہنسنے لگی اور پیڑا واپس رکھ کے لپک کے بولی۔ بس ٹانگیں مروڑنے کا بڑا شوق ہے۔ اس نے "ٹانگیں مروڑنے" کے لفظ کچھ ایسے ادا کیے جیسے کوئی فحش بات کر رہی ہو۔

رانجھے نے اسے دیکھے بغیر، اس کی کہی کا رُخ پڑھ لیا اور گردن جھکا کے شرمیلا سا ہو کے آہستہ سے بولا۔ ٹانگیں توڑنے کی بات کر رہا ہوں۔ بات نہ مروڑا کر۔

اچھا۔ اب تمہیں سمجھ آنے لگی ہے۔ باتیں مروڑنے کی بھی۔ میں تو سمجھی تھی بس تمہیں ہاتھ پاؤں ہی مروڑنے آتے ہیں۔ پہلوان جو ہوئے۔

چھوڑ دی ہے پہلوانی، کئی سال سے۔ پتہ تو ہے تمہیں۔

تم نے تو چھوڑ دی ہے، پہلوانی نے تمہیں نہیں چھوڑا۔

کیوں؟

تمہیں اور کوئی خیال آتا ہی نہیں۔ مرنے مارنے کے علاوہ۔

کیا مرنا مارنا ہے ماسی، پو پھٹنے سے پہلے گھر سے نکلنا پڑتا ہے۔ منڈی سے سبزی پھل لاتا ہوں۔ سارا دن بیچتا ہوں۔ شام کو دو لقمے کھا کے سو جاتا ہوں۔ کیا لیتا ہوں کسی کا۔ بچے چھوٹے ہیں، بیٹی بڑی ہو رہی ہے۔ ادھر پڑوسی سے دشمنی ہے۔ سو فکریں ہیں۔ خیر، نبڑلوں گا سب سے۔ بس تو دعا کر کسی سے چت نہ ہوں۔ ساری عمر میرے رب نے میری پشت نہیں زمین پہ لگنے دی۔ بہتیریاں ہتھ جوڑیاں کیں۔ کبھی ٹھا نہیں ایک بار۔ عمر دین کو میں نے یہ مقدمہ جیتنے نہیں دینا۔ چاہے کچھ ہو جائے۔

مقدمہ بھی رب تجھے جتا دے گا۔ وہ تمہیں جتاتا ہی آیا ہے۔

بس اک کریما کو میں ہار گیا۔

رب سے کشتی نہیں ہوتی پہلوان، اس کا بلاوا آیا تھا۔ تو کیسے روک لیتا۔

ٹھیک کہتی ہے تو ماسی۔ اسے جانا تھا، چلی گئی۔ لیکن ماسی اتنی جلدی کیوں تھی اسے جانے کی۔

نصیب اپنے کوئی خود تھوڑی لکھتا ہے، پہلوان۔ تُو تو کملا ہے۔ خورے رب نے تیرے گھر اب کسی اور کو بھیجنا ہو۔ وہ نہ جاتی تو آنے والی کیسے آتی۔

کس نے آنا ہے ادھر، خوامخواہ کی سوچیں نہ سوچا کر۔ پہلوان ایک بار ہی لنگوٹ کستا ہے۔ بار بار نہیں۔

بس لنگوٹ کسے رکھ۔ میں کہتی ہوں یہ تیرا گھر ہے اکھاڑہ نہیں ہے، اپنی بیٹی کا سوچ۔ کیسے دنوں میں خیر صلہ سے چوکاٹھ جتنی اونچی ہو گئی ہے۔ اس سے دکھ سکھ کرنے والی کون ہے۔ میں تو بوڑھی جان ہوں۔ آج ہوں۔ کل نہیں ہوں گی۔ تیری پہاڑ جیسی زندگی ہے۔ شیر جیسا سوہنا گبھرو جوان ہے تو۔ پورے محلے کی عورتیں تجھے دیکھ دیکھ

رنجھتی ہیں جس گلی سے گزرتا ہے تو کھڑکیوں کے پیچھے سے پٹ کھل جاتے ہیں۔

وہ سنا ہے نا۔

پھڑی نی ماں پیڑا

میں منڈا ویکھ لاں

وہ حال ہے ادھر گلی میں

تجھے لنگوٹ کسنے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ کبھی کہتا ہے پہلوانی چھوڑ دی۔ اکھاڑے کو خیر آباد کہہ دیا۔ پھر اب اس نگوڑے لنگوٹ کو بھی ڈھیلا کر۔

بے شرمی کی باتیں نہ کر، ماسی۔ رانجھا جھینپ گیا۔

لو شرع میں کیا شرم ہے، میں تجھے کوئی الٹی پٹی تھوڑی پڑھا رہی ہوں۔ یہی کہہ رہی ہوں نا کہ شادی کر لے۔ تیری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک پتہ نہیں کہاں کہاں کھے کھاتا پھرتا۔ دیکھتے نہیں ہو گلی محلے میں۔ اچھی بھلی منہ متھے والی زنانیاں گھر رکھ کے لوگ گلابی بوتل بغل میں لے کر لچے بازار میں گل چھرے اڑاتے پھرتے ہیں۔ تو اس بازار میں کبھی گیا بھی تو دنگل کرنے ہی گیا ہوگا۔

رانجھا ہنسنے لگا، ہنستے ہوئے بولا،

ایک بار ادھر دنگل لڑا تھا۔

بہت برس ہو گئے۔

جیت کے نکلا تو یار بیلیوں نے کندھوں پہ بٹھا لیا۔ ساتھ ساتھ ڈھول والا تھا۔ ڈم ڈما ڈم اس بازار میں ہونے لگی تو اوپر رنڈیوں کے کوٹھوں کی کھڑکیوں کے پٹ کھل گئے۔ کھٹ کھٹ کر کے کنڈیاں کھلیں اور کنجریاں دھلے گیلے کپڑوں کی طرح تاکیوں سے لٹکنے لگیں۔ ڈھول والا بھی وجد میں آ گیا۔ ساتھی سنگی بھی اچھل کود کرتے آپے سے باہر ہو گئے۔ اس دن اتنے ہار میرے گلے میں پڑے تھے کہ گردن سے لنگوٹی تک سارا جسم چھپ گیا۔ اور تو اور، دن دیا ہڑے، عین چوک میں جب ڈھول کا کھڑاک تیز ہوا

تو میرے دوستوں نے دائرہ بنا کے لڈی ڈالنی شروع کر دی۔ ناچ کود تو وہ کر ہی رہے تھے۔ لڈی بھنگڑے کی لے ہی کچھ ایسی تھی کہ اس بازار کی طوائفوں سے ضبط نہ ہوا۔ ان کے بازار میں سرعام بھنگڑا ناچ ہو اور مردان سے بازی لے جائیں۔ پتہ نہیں اس سوچ نے انہیں چوباروں سے اتار لیا۔

عجیب تماشہ ہو گیا۔

سامنے کے چوبارے سے تین رنڈیاں اتر کے آ گئیں اور میرے گلے میں ہار ڈال کے میرے کندھوں کو چومنے لگیں۔ ڈھول والا تو پاگل ہو گیا۔ اس نے اتنے زور زور سے ہاتھ مارے کہ لگتا تھا ڈھول پھاڑ دے گا۔ ادھر کنجریوں نے میرے کندھے چومے ادھر میرے یاروں نے بھڑکیں مارنی شروع کر دیں۔ ہلا ہلا لرکارے پڑنے لگے۔ ہر کوئی وہاں دھمال ڈالنے لگا۔ پتہ نہیں ان تینوں زنانیوں کو کیا ہوا، دن دیہاڑے بیچ چوک کے، بیسیوں مردوں کے سامنے، وہ بھی دائرے میں آ کر ناچنے لگیں اور تو اور، وہ جانی پہلوان، جس نے مجھے اٹھایا ہوا تھا اپنے کندھوں پہ، اس نے مجھے سڑک پہ اتارا، اور خود جا کے کنجریوں کے ساتھ ناچنے لگا۔ بس سارے ہجوم میں اک میں ہی ایسا مرد تھا، جو اس دن ان کے ساتھ نہیں ناچا۔

سنی ہیں میں نے یہ کہانی بھی۔ پر سنانے والے تو کہتے ہیں، زنانیاں ناچتے ناچتے تمہیں پکڑ کے بھی نچاتی رہیں۔

پکڑا تھا، انہوں نے۔ میں ساتھ ساتھ چلتا بھی رہا ان کے، مگر ناچا تھوڑی تھا۔

لے خوشی میں ناچنا گناہ تھوڑی ہے۔ خیر سے پھر اس گھر میں ناچ گانا ہو گا۔ تو مجھے منع نہ کرنا، ہاں، کہہ دیا میں نے۔

کس بات پہ؟

تیری شادی پہ، اور کس بات پہ۔

ہے کوئی، جس کی تو بات سوچے بیٹھی ہے۔

دیکھ، ہیں تو بہت تیری آس لگائے بیٹھیں۔ رب جھوٹ نہ بلوائے، دن میں کئی اڑوس پڑوس سے آ کے تیرے بارے میں پوچھتی ہیں۔ ایک تو سکھنی کہہ رہی تھی، دھرم کا مسئلہ نہ ہوتا بیچ میں تو وہ تجھے اٹھوا لیتی۔ تو سادھو بنا بیٹھا ہے۔

دیکھ میرا دماغ خراب نہ کر ماسی۔

دو روٹیاں کھانی ہوتی ہیں شام کو، وہ تو کھلا دیتی ہے۔ دن کو منڈی کے ہوٹل سے کھانا منگوا لیتا ہوں۔ کریما کے وقت بازار کی روٹی کا لقمہ نہیں توڑا۔ کہیں مقدمے، پیشی پہ بھی جانا ہوتا تو ٹفن میں باندھ کے اپنا پکا کھانا ساتھ دے کر جانے دیتی۔ کریما جیسی عورت دیکھی۔

تو نے دیکھا ہی کیا ہے، پہلوان۔

بہتیری دنیا دیکھی ہے ماسی۔ میں کیا بچہ ہوں۔

بچے ہی ہو۔ سر پہ پٹکا ڈال کے، آنکھیں جھکا کے گلی میں چلتے ہو۔

تجھے کیا خبر ادھر ادھر دنیا میں کیا رنگ ہیں۔

کیوں کوئی خاص بات ہو گئی، رانجھے نے شرارت سے سر اٹھایا۔

کبھی اپنے گھر کے پچھواڑے میں آئے نئے کرایہ دار دیکھے؟

وہ جو دہلی سے آئے ہیں، جن کا تو ذکر کرتی رہتی ہے۔

ہاں۔

انہیں کیا ہے؟

وہ تیری خوش نصیبی ہیں۔

کیوں، تو کہتی تھی، بڑی بد نصیبی ہوئی ان کی۔ کارخانہ لٹ گیا۔ بھائی نے نمک حرامی کی دہلی میں ان سے۔ لٹ پٹ کے ادھر آئے ہیں بیچارے۔ انہی کی بات کر رہی ہو، نا!

ہاں، لٹ پٹ تو وہ گئے۔ نوابوں کی طرح کبھی دہلی میں راج کرتے تھے۔ بس

براوقت خدا کسی پہ نہ لائے۔ ان پہ براوقت آ گیا۔ کہاں ریشم لگی پالکیوں میں مخمل کے گاؤ تکیے لگا کے وہ ماں بیٹی پھرتی تھیں اور کہاں اب پرانے چیتھڑے پہن کے اپنی آبرو بچائے بیٹھی ہیں۔ مگر وہ کہاوت سنی ہے نا۔ لعل چیتھڑوں میں بھی چمکتے ہیں۔ میں نے بھی بچپن سے سن رکھی تھی یہ کہاوت۔ اس بڑھیا کی بیٹی ارجمند بانو کو دیکھا تو یقین آ گیا۔

لعل چمکتے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے۔

شکر کر تو نے اسے دیکھا نہیں،

ایک نظر دیکھ لیتا تو ساری عمر کے اپنے پہلوانی دھوبی پٹکے بھول جاتا، ایسا دھوبی پٹکا تمہیں پڑتا تھا۔ ایک پل میں تو نے چت ہو جانا تھا۔

میں چت ہونے والوں میں سے نہیں ماسی۔

پہلوان، اسے چت ہونا نہیں کہتے۔ یہ تو خوش نصیبی کی بات ہوگی تیری۔ وہ کڑی صرف منہ متھے کی ہی سوہنی ہیر نہیں ہے۔ سات سنگھار بھی ساتھ ہیں اس کے۔ سینا پرونا، کھانا پکانا، کڑھائی سلائی، اٹھنا بیٹھنا، بولنا چلنا اور اوپر سے کئی جماعتیں پڑھی ہوئی بھی ہے۔ کم عمری میں بے چاری کے ہاتھ پیلے ہو گئے تھے۔ میاں انگریزوں کی جنگ میں زخمی ہو کے مر گیا۔ ایک چھ سات سال کی بیٹی ہے اس کی۔ وہ لڑکی بھی اس کی نانی رکھ لے گی۔ مجھے پتہ ہے۔ بڑی حیا والے لوگ ہیں وہ۔ ایسی ہیرے کی کنی جیسی کڑی ہے۔ کوئی دیکھ کے کہہ نہیں سکتا کہ ایک بیٹی کی ماں ہے۔ گوری چٹی، پتلی لمبی، ایسی نگینے جیسی آنکھیں ہیں اس کی۔ جدھر دیکھ لیتی ہے باندھ کے رکھ لیتی ہے۔ میرا اپنا کوئی پوت ہوتا تو اس گھر کی دہلیز جا جا دھوتی۔ پلو پھیلا کے اس کا رشتہ مانگتی۔ مگر مجھ بدنصیب کا کون ہے۔ میاں تانگہ چلاتا تھا۔ انگریز کی موٹر نیچے آ کے مر گیا۔ گھوڑی اس کی بھی میری طرح لنگڑی ہو گئی۔ مر کھپ گئی ہوگی کہیں وہ بھی۔ میں ایک رہ گئی گھر گھر برتن مانجنے کے لئے۔ دو بیٹے ہوئے تھے۔ دونوں کم عمری میں طاعون سے مر گئے۔ میرا

کون ہے، شیداں دکھی ہو کے اپنے گالوں پہ آئے آنسو پونچھنے لگی۔

ایسی باتیں نہ کرو ماسی، طاعون کا پھوڑا تو بچپن میں میرے بھی نکلا تھا۔ مگر میں بچ گیا۔ میرے نو بھائی پلیگ میں مرے تھے۔ میرے سترہ بھائی تھے۔ پانچ بچے۔ میں اٹھارواں ہوں۔ رب میری جگہ تیرا کوئی بیٹا بچا لیتا تو وہ تیرے آنسو تو پونچھتا۔

تیرے صدقے واری، رانجھے۔ ایسی باتیں نہ کر۔

شیداں جلدی جلدی اپنے آنسو پونچھ کے دھاڑیں مار کے روتی ہوئی رانجھے سے لپٹ گئی۔ اور روتے روتے بولی، میری عمر بھی رب تجھے دے دے۔ ایسی باتیں نہ کرا کر۔ میرا بیٹا ہے تو۔ پر تو مجھے اپنی ماں جیسا نہیں سمجھتا نا۔ یہ کہہ کے شیداں ایک دم سے رانجھے سے جدا ہوئی اور نگہ میں ہزاروں گلے بھر کے محبت سے رانجھے کو دیکھنے لگی۔

ماسی، کونسی بات تیری ٹالی ہے؟

میرے کہنے سے دوسرا بیاہ کیوں نہیں کرتا؟

ماسی تو وہ، پچھوڑے والوں کی کیا بات کہہ رہی تھی؟ رانجھا چوروں کی طرح ترچھی شرارتی آنکھ سے پوچھنے لگا۔

شیداں روتے روتے ہنس پڑی، اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کے، آنکھوں کے سامنے لا کے کنپٹیوں پہ انگلیاں بجا کے صدقے واری جانے کا اشارہ کر کے بولی،

واری جاؤں، ارجمند بانو اور تیری کیا جوڑی بنے گی۔

ہیر رانجھے کی کہانی لوگوں نے تو صرف سن رکھی ہے۔

وہ سچ مچ کی ہیر ہے۔

تیرے گھر آ گئی تو تیرا گھر سج جانا ہے۔

تیرے بیٹے اور بیٹی کی پہلے ہی ان سے بنی ہوئی ہے۔ دیکھ تیرے بچے بے چارے کیسے بن ماں کے مارے مارے پھرتے ہیں۔ میں سارا دن ادھر تھوڑی بیٹھی رہتی ہوں۔ تین چار اور گھروں میں جا کے برتن مانجتی ہوں۔ کیسے میلے برتنوں کی طرح

تیرے بچوں کے چہرے ہوئے رہتے ہیں۔ تو یہ گھر آباد کر لے۔ تیرے بچے بھی سج جائیں گے۔ یہ اجڑا ہوا گھر اس ہیرنے آ کے ایسا سجا دینا ہے جیسے لاٹ صاحب نے دہلی سجائی ہوئی ہے۔ تو میری بات مان لے۔ ایک بار اس لڑکی کو دیکھ تو سہی۔ پر وہ تیرے سامنے ایسے تھوڑی آئے گی۔ پردہ دار کڑی ہے۔ اندھیرے میں رکھو تو لاٹیں مارتی ہے۔ تیرے گھر آ گئی تو تجھے شام کو دیا جلانے کی ضرورت نہیں رہنی۔

ماسی اب اتنی بھی بات نہ بنا۔

میں جھوٹ بولوں تو میرے منہ میں سور۔ تو نے ایک نظر اسے دیکھ لیا تو تیرے منہ سے بات نہیں نکلنی۔

تو اسے یہاں لا کے، کیا میں گونگا بنا رہوں گا، رانجھا ہنسنے لگا۔

تو ایک بار اسے لے تو آ، وہ گونگوں کو بولنا بھی سکھانا جانتی ہے۔ میں تجھے سمجھا نہیں سکتی کہ وہ ہے کیا! تو کہے تو میں اس کی ماں سے بات کروں۔ یہ کہہ کے شیداں غور سے سر اٹھا کے رانجھے کو ٹکٹکی لگا کے تکتی ہے۔ رانجھا سر جھکا کے خاموشی سے بیٹھا ہوا، اپنے سامنے پڑی روٹیوں کی چنگیر میں پڑی روٹی کو توڑے بغیر اس کے سرے پہ انگلی رکھ کے گھمانے لگتا ہے۔

شیداں ایک دم فیصلہ کن انداز میں بول پڑتی ہے۔

تو بول نہ بول،

میں نے اس کی ماں سے بات کر دینی ہے۔

ہائیں کوئی اور سوالی بن کے ادھر پہنچ گیا تو اس گھر کی روشنی گئی۔ ویسے بھی عمر دین کے ساتھ کا دروازہ ہے ان کا۔ رنگ برنگے عمر دین کو ملنے والے ہیں، تو تو جانتا ہی ہے۔ میں اسے ادھر اب نہیں رہنے دوں گی۔ تو مجھے ماسی کہتا ہے، پتہ ہے ماسی، ماں کی بہن کو کہتے ہیں۔ ماں نہ ہو تو ماسی ہی ماں ہوتی ہے۔ تیری ماں تجھے کہتی تو اس کا کہنا ٹالتا۔

لے میں نے اپنی ماں کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ سنا ہے اس کا نام ایمنا تھا، پتہ ہی نہیں کیسی تھی میری ماں۔ ماسی بھی کوئی مجھے پالنے نہیں آئی۔ بھرجائی ایساں (عائشہ) نے پالا تھا۔ اسے نے بیاہا۔ کریما مرگئی تو بھرجائی بھی روٹھ گئی۔ اب گھر بساؤں گا تو وہ برا نہیں مانے گی۔

کیوں، برا مانے گی اس میں کیا برائی ہے۔ تیری بھرجائی کا بھائی جب رنڈا ہو گیا تو وہ اس کا رشتہ لے کر نہیں گئی تیرے نواب بھائی غلام محمد کے گھر؟

گئی۔

پھر تجھ سے کس بات کا بیر ہے۔ تو نے کریما کے ساتھ جو نبھائی ایسی کون نبھاتا ہے ادھر۔ یہاں تو مردوں کا یہ حال ہے، ادھر بیوی مری، ادھر وہ دوسری لے آئے۔ تجھے تو عمر دین کے مقدمے نے باندھ کے رکھا، ورنہ تو نے کونسی ڈھیل کرنی تھی۔

عمر دین کا طعنہ نہ دے۔ وہ تو میں انگریز کی عدالت پہ بھروسہ کرتا ہوں، ورنہ عمر دین جیسے چار بندوں سے دو گھڑی میں سارا مقدمہ نپٹا دوں۔

خورے تو اس لئے گھبرا رہا ہے، کہ ارجمند بانو عمر دین کی کرایہ دار ہے۔ سوچ رہا ہوگا، ادھر اپنی جج لے کے گیا تو فساد نہ ہو جائے۔

ماسی،

عمر دین کی بات نہ کر۔

اس کی ہستی کیا ہے۔

میں اس کی گلی میں جس دن گیا، اس نے خوف سے موندے ہو جانا ہے۔ تو مجھے جانتی نہیں ہے۔ ایک کمی ماری تھی گائے کو، چڑی کی طرح پھڑک کے گزگئی تھی۔ چار سال اس کا مقدمہ بھگتا ہے۔ پتہ ہے نا۔

پتہ ہے۔ مقدمے بھگتتے بھگتتے، بھوتنا بن گیا ہے مگر بخت بسانے کا سلیقہ نہیں آیا تجھے۔

اچھا ماسی، سکھا دے یہ سلیقہ بھی۔ اب پڑھنے ڈال دے مجھے۔

ہاں تیری اگلی پچھلی نسلوں کو سنوار دے گی وہ۔ اتنی سنوری ہوئی لڑکی ہے ارجمند بانو۔ دُعا کر اس کی ماں مان جائے۔

لے اتنی دعائیں کرنے کی عادت نہیں ہے اپنی۔ تو زیادہ تنگ کرے گی تو اٹھا کے لے آؤں گا تیری ارجمند بانو کو، ایک مقدمہ ہی ہے نا۔ اور سہی۔ رانجھا ہنسنے لگتا ہے۔

صدقے

واری

یہ ہوئی نامردوالی بات۔

اب میں منالوں گی، اس کی ماں کو۔

چاہے میری جوتیاں گھس جائیں۔

رب بھلی کرے۔

اب بے فکری ہے۔

تین چار دن بعد، شیداں اپنے ساتھ ارجمند بانو کی ماں کو رانجھے کے گھر لے کے آتی ہے۔ رانجھا ادب سے اُٹھ کے سلام کرتا ہے۔ اور کھڑی چارپائی جلدی سے بچھا کے، اس پہ چادر کھینچ کے سیدھی کرتا ہے، تکیہ رکھتا ہے اور ایک طرف کھڑا ہو کے ارجمند بانو کی ماں کو بیٹھنے کو کہتا ہے۔ وہ بیٹھ جاتی ہے۔ شیداں قریب ہی پیڑھی کھینچ کے بیٹھ جاتی ہے۔ رانجھا اندر کمرے سے ایک موڑھا نکال کے اس پہ آ کے بیٹھ جاتا ہے۔ ارجمند بانو کی ماں اپنی کہانی سنانے لگتی ہے۔ کہانی سناتے سناتے کئی بار وہ آبدیدہ ہوتی ہے۔ کئی بار مسکراتی ہے۔ رانجھا ارجمند بانو کی بوڑھی ماں کی میلی ہوئی اجلی رنگت مٹے مٹے تیکھے نقوش پروقار سراپا اور بات چیت کرنے کے پراعتماد انداز کو دیکھ دیکھ متاثر ہوتا رہتا ہے۔

ارجمند بانو کی ماں، اپنی کہانی سناتی سناتی، رانجھے کے بھائی چوہدری غلام محمد تک اپنی کہانی لے آتی ہے۔ کیسے چوہدری غلام محمد سے سات ہزار دو سو روپے کی بجائے سات مہینوں میں پندرہ سو وصول ہوتے ہیں۔

رانجھے کے کان سرخ ہو جاتے ہیں۔

وہ منہ سے کچھ نہیں کہتا۔

سوچتا ہے، ارجمند بانو کی ماں کو پتہ ہو گا، میں اسی غلام محمد کا بھائی ہوں، کیا سوچتی ہو گی یہ میرے بارے میں۔

ارجمند بانو کی ماں، چوہدری غلام محمد سے اپنی آخری ملاقات کا قصہ سنانے لگتی ہے کہ کیسے اس نے عمر دین سے کرایے پر لیا ہوا گھر، اٹھارہ سو میں خرید لیا۔

اب رانجھے سے مزید موڑھے پہ نہیں بیٹھا گیا۔

وہ ایک دم اٹھ کے کھڑا ہو جاتا ہے جیسے موڑھے میں کوئی میخ اسے چبھی ہو۔

عمر دین کی ایسی تیسی، وہ چوتھے محلے والوں کو کیسے جا کے گھر بیچ آیا۔

آپ آئیں میرے ساتھ،

میں چل کے پوچھتا ہوں، گھر خریدنے والے سے۔

رانجھے نے کندھے پہ رکھا پٹکا اٹھا کے جھٹکا اور ارجمند بانو کی ماں کو ساتھ چلنے کا اشارہ دے کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر سے نکل پڑا۔

(شیداں پیڑھی پہ بیٹھی ہوئی منہ کھولے ان دونوں کو گھر سے نکلتے ہوئے دیکھ کے سوچتی رہی، میں کیا بات کروانے بڑھیا کو لائی تھی، بات کدھر چل پڑی۔)

چوڑے بازار کی بغل میں بڑی کلاتھ مارکیٹ کی سب سے بڑی دکان کے ماتھے پہ بورڈ لگا تھا، ''چوہدری غلام محمد کلاتھ مرچنٹ''۔ دن کا پہلا پہر تھا۔ لوگوں کی ریل پیل لگی تھی۔ اس ہجوم میں مست ہاتھی کی طرح مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا رانجھا پہلوان بازو چوڑے کیے اس انداز میں چلے جا رہا تھا، جیسے اکھاڑے میں دنگل کھیلنے جا رہا ہو اور بس

منظر میں ڈھول بج رہا ہو۔اس کے پیچھے پیچھے چادر کے پلو سے منہ سر ڈھانپے ہوئے، ارجمند بانو کی بوڑھی ماں سہمی سہمی سی تیز تیز قدم اٹھاتی جا رہی تھی۔ رانجھے کو آتا دیکھ کے راہ چلتے لوگ دب کے خود بخود راستہ دے دیتے۔ کسی راہ چلتے بندے کو رانجھے کی کہنی یا بازو جا لگتا تو الٹا وہی خفیف سا ہو کے راہ چھوڑ کے ایک طرف ہٹ کے رانجھے کے چلنے کو دیکھ دیکھ رتجھنے لگتا۔ دو پل میں رانجھے نے کلاتھ مارکیٹ پار کی اور جا کے اپنے بڑے بھائی غلام محمد کی دکان کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ چوہدری غلام محمد سامنے بیٹھا تھا۔ رانجھے کو آتا دیکھ ایک دم سے حیراں حیراں سا چہرہ بنا کے اپنی گدی سے اُٹھا اور ہاتھ پھیلا کے پر جوش انداز میں اپنے اندر کا کوئی خوف دبا کے اونچی آواز میں بولا۔

بسم اللہ میرا شیر بھائی آیا ہے، اٹھو۔ اوئے جگہ دو۔

دو تین بچ پر بیٹھے ہوئے لوگ اپنی جگہ سے ہٹے اور رانجھا گھٹنے پہ گھٹنا رکھ کے بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں ارجمند بانو کی ماں بھی گھٹتی گھٹتی دکان کی سیڑھیوں تک آ گئی۔ مگر غلام محمد نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ ابھی تک رانجھے کے پاس کھڑا اس کی کمر پہ تھپکیاں دے رہا تھا۔ تھپکیاں دیتے دیتے، وہ اپنے منشی سے بولا،

منشی جی،

بھاگ کے سوڈے کی بوتل لاؤ، ٹھنڈی ایک، میرے بھائی کے لئے۔

"ایک نہیں، دو بوتلیں لانا منشی"

رانجھے نے پہلی بار ادھر منہ کھولا، اور پھر سیڑھیوں کے پاس کھڑی ارجمند بانو کی ماں کو اشارہ کر کے بلاتے ہوئے بولا،

خالہ آ جائیں۔ اوپر،

ادھر بیٹھیں میرے ساتھ۔

ارجمند بانو کی ماں سیڑھیاں چڑھ کے جب اوپر آئی تو غلام محمد نے اسے دیکھا لیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک دم سے شعلہ ناچا اور وہ بولا۔

''مائی میں نے تمہیں کہا تھا، کوتوالی سے سپاہی لے کر آنا، جب آئی، تو مجسٹریٹ لے کر آ گئی ہے۔''

بڑے بھائی، مجسٹریٹ نہیں، تجھے سول جج سے ملوا دوں گا، تو حوصلہ تو رکھ۔ ادھر سامنے بیٹھ کے بات کر۔ رانجھا چوہدری غلام محمد کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

غلام محمد ایک دم سے اپنی گدی پہ واپس بیٹھ جاتا ہے، اس کا چہرہ کہتا ہے، جیسے وہ سمجھ گیا ہے، بات یہاں کافی لمبی ہونے والی ہے۔ اور دکان میں گاہکی کے وقت لمبی باتیں کرنا دکانداری کے حق میں نہیں ہوتا۔ اس کے اندر ہی اندر کوئی الارم سا بجتا ہے جیسے بات جتنی جلدی ٹلے، ٹالو، وہ بے چینی سے بیٹھتے ہی بظاہر جعلی اطمینان چہرے پہ لا کے کہتا ہے،

''کیا بات کرنی ہے؟''

''بات یہ کرنی ہے کہ میرے محلے میں، عمر دین تجھے اپنا گھر کیسے بیچنے لگا ہے۔''

رانجھا اپنے داہنے کندھے سے پٹکا اتار کے گردن کے پیچھے رگڑتے ہوئے بڑے بھائی کی طرف آنکھیں کھول کے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

اس نے تو بیچ دیا۔ غلام محمد بولا، اس کا چہرہ کہہ رہا تھا، اسے رانجھے کی بات سمجھ نہیں آئی۔

اسے پتہ نہیں، اس کے گھر کی دیوار پچھواڑے میں میرے گھر سے جڑی ہے۔ رانجھا بولا۔

یہ تو عمر دین سے پوچھ، مجھ سے کیوں پوچھتا ہے۔

خریدنے والے کو بھی پتہ ہونا چاہیے، بھائی،

قانون تو نے بھی کچھ پڑھا ہوگا۔ حق شفع کی شقیں تو نے ابھی تک نہیں پڑھیں۔

تو پڑھانے آیا ہے مجھے!

نہیں بتانے آیا ہوں۔

کیا؟

وہ گھر تو نہیں خرید سکتا۔

کیوں، پیسے دیے ہیں میں نے۔

تیرے پیسے تجھے پورے مل جائیں گے۔ عمر دین سے تو سودا نہیں کر سکتا۔

وجہ، میرے پیسے کھوٹے ہیں۔

پیسے کھوٹے ہوں نہ ہوں، تیرے من میں کھوٹ ہے۔

کیوں، کھوٹ کس بات کا، ہیں، پہلوانی کرتے کرتے تیرا دماغ ہل گیا ہے۔ ہر بات تمہیں الٹی نظر آتی ہے۔ کھوٹ کس بات کا ہونا ہے۔ عمر دین پچھلے دس سال سے سو دو سو کر کے مجھ سے۔ سولہ سو روپیہ قرض لے چکا تھا۔ مجھے پتہ ہے اس کی ہتھیلی میں موری ہے۔ پیسہ اس کی جیب میں نہیں ٹکتا۔ تیرے ساتھ احاطے کے مقدمے کی پیروی میں بہتیرا روپیہ اس نے اجاڑ دیا۔ باقی تھانے داروں، حوالداروں کو مرغے کھلا کے لٹا دیا۔ سوچا، پیسے تو ملنے نہیں، کوئی اور کام کروں۔ دو سو روپیہ دے کر اس سے وہ تین کمروں کا گھر لے لیا کہ چلو، کبھی کپڑے کے گودام کے لئے جگہ درکار ہوئی تو تیرے پچھواڑے میں مال محفوظ رہے گا، تو پتہ نہیں کس کھوٹ کی میل سونگھ کے مست ہاتھی کی طرح لہراتا ادھر آ گیا ہے۔ عقل ہے نہیں۔ پہلوانی آتی ہے صرف۔

اچھا، عقل تو واقعی نہیں آئی مجھے، کہ میرا ہی بھائی، میرے دشمن کو پیسے دے کر میرے خلاف مقدمہ جتوانے کے چکر میں ہے۔ واہ۔

مجھے تیرے مقدمے سے کیا لینا دینا۔ وہ قرض لیتا تھا، میں دے دیتا تھا۔ تو بھی لے لینا جب تجھے تھوڑ ہوئی۔

مجھے اللہ نہ تھوڑ دے۔ میں تجھ سے لینے نہیں کچھ دینے ہی آیا ہوں۔ بہتری اسی میں ہے کہ سودا موڑ دے۔ مجھے تو کچہری مقدمے کی عادت ہے۔ یہ شفع کا مقدمہ تو مجھ سے نہیں جیت سکتا۔ عدالت میں بھی تو نے مجھ سے پیسے لے کر گھر دینا ہے۔ ابھی

پیسے لے لے، جتنے لئے ہیں ان سے سو پچاس اوپر دینے کو راضی ہوں میں۔ ورنہ آ جانا ادھر کچہری میں۔ باقی باتیں وکیلوں کے ذریعے کروں گا۔

او بیٹھ جا، بڑا آیا، وکیلوں کے ذریعے بات کرنے والا لاٹ صاحب۔ غلام محمد رانجھے کو ڈانٹ کے بولا۔ تجھے ساری بات بتادی ہے۔ جی جی۔ کہ عمر دین کے پاس میرے پیسے مرے ہوئے تھے۔ سوچا کھرے کرلوں۔ ورنہ میں نے کیا کرنا ہے وہاں۔ تیری جھونپڑپٹی میں گھر لے کر۔

یہی تو میں پوچھنے آیا ہوں، حویلیوں والوں سے کہ کیوں ہماری جھونپڑپٹی میں آ کے گندے ہونا ہے۔ جتنے پر سودا عمر دین سے کیا ہے، اتنا مجھ سے کرلے۔ اوپر لے لے۔ جتنا لینا ہے۔

اوہ، بیٹھارہ، اوپر دینے والا تو، سیدھی طرح ٹھنڈا ہو کے بات کیا کر۔ چل ہو گیا وہ گھر تیرا۔ یہ پکڑ بوتل آ گئی ہے۔ پی بوتل۔ (رانجھا بوتل پکڑ لیتا ہے مگر منہ کو نہیں لگاتا) غلام محمد پھر اپنے منشی کی طرف دیکھتا ہے۔ اسے پوچھتا ہے۔

وہ عمر دین والے مکان کے کاغذ تیرے پاس ہیں؟

جی۔

چل اٹھ کچہری میں لے جاکے، رانجھے کے نام کرادے ابھی۔ سمجھ گئے۔

جی

(منشی گلے میں سے کاغذات کے بنڈل سے کچھ کاغذ نکال کے اٹھ کے چل پڑتا ہے)

پیسے ابھی کچہری میں لے آؤں، یا ادھر لا کے دوں۔

رانجھا بوتل کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھتا ہے۔

بس آ گئے تیرے پیسے، جب مرضی لے آنا۔ جدھر جی چاہے۔

جدھر مرضی کیوں، جدھر کاغذ بننے ہیں، ادھر ہی پیسے لے کے جاؤں گا۔ تیرا کیا

ہے بڑا آدمی ہے۔ تجھے کیا ہوا یاد تھوڑی رہتا ہے۔

پھر، ٹانچ کر رہا ہے۔ کس لیے کی بات کر رہا ہے جو بھول گیا ہوں میں؟ غلام محمد کہتا ہے۔

یہ بیٹھی ہے خالہ، تمہارے دوست لال خان کی بیوہ۔ اس سے پوچھو، یہ بتائے گی تمہیں! رانجھا ارجمند بانو کی ماں کی طرف اشارہ کر کے بولا (جو ہونق ہوئی گھبرائی ہوئی یہاں اور طرح کی باتوں کو سنتے سنتے اچانک اپنی طرف کے اشارہ سے گھبرا گئی اور چادر کے اندر اپنے لپٹے ہوئے چہرے پہ ایک دم مرونی سی لا کے غمگین ہو کے چپ بیٹھی ایک موہوم سی امید کے ساتھ غلام محمد کو دیکھنے لگی)

غلام محمد نے ارجمند بانو کی ماں کو بھویں اٹھا کے ایک نظر دیکھا اور اس کی نگہ سے بچتے ہوئے بات بدل کے رانجھے کو چھیڑنے کے انداز میں پوچھا۔

کیوں، بڑھیا کو خالہ بنا لیا، کوئی رشتے داری تو نہیں بنانے والے اس گھر سے۔

سگے رشتے دار اگر ظالم نکلیں تو مظلوموں سے رشتے داری بہتر۔

تمہیں کوئی اعتراض؟

نا، ہمیں کیا ہونا ہے۔ پر یہ ظالم رشتے دار کون ہیں تیرے؟ جن کی بیٹی بیوی بنا کے بیٹے سے مروا دی۔ وہ ظالم ہیں، یا میں ظالم ہوں، جو سندیسے بھیج بھیج تھک گیا کہ مقدمے بازی چھوڑ، گھر بسا۔ دوسرا بیاہ کر لے۔

تمہارے سندیسے کی ضرورت نہیں ہے، سندیسہ تو میں دینے آیا ہوں اپنے بیاہ کا کہ میرے بیاہ پر آنا۔ یہ بیٹھی ہیں، میری ہونے والی ساس۔ رانجھا، ارجمند بانو کی ماں کی طرف اشارہ کر کے ایک دم سے ساری بات کہہ جاتا ہے۔ ارجمند بانو کی ماں چادر کا پلو چہرے کے آگے پکڑے بیٹھی تھی، رانجھے کے منہ سے ایک دم سے اتنی بڑی رشتے داری کی بات سن کے، اس کے ہاتھ سے پکڑا ہوا پلو چھوٹ جاتا ہے۔ اور اس کے چہرے پہ ایسی خوشی کی صبح طلوع ہوتی ہے جیسے ایک دم اس کے نصیب میں سورج چڑھ

گیا ہو۔ وہ جذبات سے مغلوب ہو کے رانجھے کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کے کہتی ہے۔

جیتے رہو بیٹا۔ جگ جگ جیو،

وہ دونوں ہاتھوں کی پشت اپنی آنکھوں کے کونوں سے چھو کے رانجھے کی نظر اتارتی ہے اور اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے بوند بوند آنسوؤں کو انہی ہاتھوں سے چھو کے اپنے چہرے پہ مل لیتی ہے۔ اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگتا ہے۔

غلام محمد خاموشی سے، کچھ دیر رانجھے اور ارجمند بانو کی ماں کو دیکھتا رہتا ہے۔ ایک عجیب طرح کا تذبذب اس کی آنکھوں میں جھلکتا ہے۔ جیسے اسے سمجھ نہیں آ رہی کہ یہ خوشی کا موقع ہے یا نہیں۔ پھر ایکا ایکی میں اٹھ کے دکان کے اندر سے اپنے کسی نوکر کو آواز دے کر بلاتا ہے۔ نوکر پاس آتا ہے تو اسے کہتا ہے،

چل بھاگ کے پانچ سیر مٹھائی تلوا کے لا،

میرا بھائی بیاہ کے لئے راضی ہو گیا۔

پورے بازار میں مٹھائی بانٹوں گا۔

یاد ہے جب تو گائے مارنے کے مقدمے سے رہا ہوا تھا تو اسی طرح مٹھائی بٹی تھی۔ کتنا عرصہ ہو گیا کوئی اچھی خبر ہی نہیں سنی۔

پھر غلام محمد ارجمند بانو کی ماں کی طرف متوجہ ہوا اور قدرے سنبھل کے بولا۔

خالہ، پورے شہر میں میرے بھائی جیسا آپ کو داماد نہیں ملنا تھا۔ یہ ہیرا ہے، ہیرا۔ بس ہم سے تراشا نہیں گیا ٹھیک سے۔ اسی لئے ہر ایک کو کاٹتا پھرتا ہے۔ مجھے امید ہے آپ کی بیٹی ہماری بہن، اس کا گھر ہی نہیں اس کا مزاج بھی سجا دے گی۔

ارجمند بانو کی والدہ، سر پہ ہاتھ رکھ کے، غلام محمد کو آداب عرض کرتی ہے اور آہستگی سے کہتی ہے خدا بھلی کرے گا۔

اب تو ہم بھی اس شہر میں آبرومند ہو گئے۔

وہ پھر محبت سے رانجھے کو دیکھنے لگتی ہے۔

رانجھے سنو،

غلام محمد لاڈ اور مان سے رانجھے سے مخاطب ہوتا ہے، تو بیاہ کی تاریخ اپنی مرضی سے رکھ۔ ہمیں دو دن پہلے بتانا ہے۔ اور یاد رکھنا، تیری برات میری حویلی سے جائے گی خالہ کے گھر۔ سن لیا نا۔

ساتھ ہی تو میرا گھر ہے ان کے۔ اتنا لمبا چکر کیوں لگوانا ہے، شہر میں۔

کیوں، شہر والوں کو خبر نہیں کرنی کہ چوہدری غلام محمد کے بھائی کا بیاہ ہے۔

شہر والے رانجھے کو ہر چوہدری سے زیادہ جانتے ہیں۔

کیوں مجھے کم جانتے ہیں، پہلوان نہیں ہوں اس لئے۔ غلام محمد اپنی سبکی سن کے مسکراتے ہوئے کہتا ہے۔ اس کے مسکرانے کے انداز میں ہنسی اڑانے کا رنگ ہوتا ہے۔

نہیں، بہت اچھی طرح جانتے ہیں تمہیں بھائی۔ جو نہیں بھی جانتے ہوں گے وہ خالہ کی ماری ہوئی تمہاری رقم کی کہانی سن کے اور جان لیں گے۔

دیکھ، تو پھر ٹیڑھی بات کر رہا ہے۔

کیوں، سچی بات ٹیڑھی ہوتی ہے۔

ہاں ہوتی ہے۔

تو سیدھی کردے۔ لینا دینا صاف رکھا کر۔

تو مجھے سبق نہ پڑھا۔ میرے ہاتھوں میں کھیلا ہے تو۔ شرم حیا بھی کیا کر کبھی بڑے کی (رانجھا ڈانٹ سن کے سر جھکا لیتا ہے) غلام محمد رانجھے کو مودب بنا بیٹھا دیکھ کے اپنی بات پھر کہنے لگتا ہے، کہتا ہے میں کہہ رہا تھا برات میں شہر کے کچھ معزز لوگ بلائیں گے۔ کوئی دو چار بگھیاں، ایک دو موٹریں سجائیں گے۔ اپنی برادری اتنی ہے کہ دس تانگے ان سے بھر جائیں۔ اس بہانے سب کا میل ملاپ ہو جانا ہے۔ تیرا کیا جاتا

ہے۔ میرا گھر خیر سے بہتیرا کھلا ہے۔ حویلی کے ساتھ بڑا طویلہ ہے۔ گلیاں بازار بھی میری طرف چوڑے ہیں۔ بگھیاں موٹریں اور کدھر سے گزریں گی۔

رہنے دے بھائی، نہ برادری سے مجھے کچھ لینا ہے، نہ تجھ سے۔ جس نے آنا ہو، اسی جھوپڑپٹی میں آجائے۔

تو ابھی تک اس بات کو پکڑ کے بیٹھا ہے۔

ہاں، مجھ سے سی باتیں نہیں چھوڑی جاتیں۔

میں سمجھا رہا ہوں، بگھی موٹر تیری گلی سے نہیں گزرنی۔ تو سمجھتا نہیں۔

رانجھا غلام محمد کی بات سن کے بیٹھا بیٹھا پہلو بدل لیتا ہے۔ اور ہاتھ ہلا کے کہنے لگتا ہے، دیکھ بھائی جب بگھیاں موٹروں والوں سے رشتہ جوڑا، تو وعدہ رہا، برات تیری گلی سے ہی گزاروں گا۔ سرکاری بینڈ باجے کے ساتھ۔ فی الحال میں نے نکاح کرنا ہے، سادگی سے۔ پرسوں شام۔ ٹھیک ہے خالہ، (وہ ارجمند بانو کی ماں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ وہ خوشی سے اثبات میں سر ہلا دیتی ہے) دو دن پہلے سندیسہ دے دیا۔ وقت ملے تو آجانا۔ مکان کے پیسے شام تک تجھے پہنچ جائیں گے۔

چل خالہ۔ اچھا بھائی خدا حافظ۔

دو دن بعد رانجھے اور ارجمند بانو کی سادگی سے چند محلے داروں کی شرکت سے شادی ہو جاتی ہے۔ (شادی کی رسم میں غلام محمد یا رانجھے کے دوسرے بھائی نہیں آتے مگر عمر دین آپہنچتا ہے۔ رانجھا اسے گلے لگا کے اپنے ساتھ بٹھا لیتا ہے۔ عمر دین ہی رانجھے کے نکاح کا، رانجھے کی طرف سے نامزد گواہ ہوتا ہے) شادی میں رانجھے کے اڑوسی پڑوسی سارے شامل ہوتے ہیں۔ ہندو بھی مسلمان بھی سکھ بھی۔ مگر رانجھا اپنے نکاح کے لئے نکاح خواں اس محلے کی مسجد سے بلانے کی بجائے لدھیانے سے نو میل دور موضوع پھلور کے پاس والے گاؤں ماؤ میووال کی بزرگ ہستی سائیں بگو شاہ کو بلواتا ہے۔ جن کا وہ عقیدت مند ہوتا ہے۔ سال بعد رانجھے اور ارجمند بانو کے گھر ایک

بیٹی پیدا ہوتی ہے۔ جس دن وہ بیٹی پیدا ہوتی ہے، اسی دن رانجھے کے سترہ سال سے چلے آتے عمر دین سے مسلمانوں کے مشترکہ احاطے کے مقدمے کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ رانجھے نے چونکہ ارجمند بانو کی ماں والا، عمر دین کا گھر، غلام محمد سے لے کر خود خرید لیا تھا، اس لئے عمر دین کی گلی میں رانجھے کا دروازہ ہو جاتا ہے۔ دونوں گھروں کو رانجھا اندر سے جوڑ دیتا ہے۔ عدالت میں عمر دین کے پاس رانجھے کی بات جھٹلانے کے لئے، پہلے جو محلے کے پچھواڑے کا بہانہ تھا۔ وہ نہیں رہتا۔

رانجھا مقدمہ جیت جاتا ہے۔

پورے محلے میں مسلمان جشن مناتے ہیں، پٹاخے چھوڑتے ہیں، شرلیاں چلاتے ہیں۔ جیتے ہوئے، مسجد کے ساتھ اور شیر غازیؒ کے دربار سے منسلک اونچی ٹالیوں والے کھلے احاطے کو جھنڈیوں سے سجاتے ہیں۔ مسجد میں اگربتیاں جلاتے ہیں۔ دربار میں قبر پہ نئی سبز چادریں چڑھاتے ہیں۔ لڈو بانٹتے ہیں۔ انہی لڈوؤں کے ساتھ ساتھ رانجھا اپنی نوزائیدہ بیٹی کی ولادت پہ مٹھائی بانٹتا پھرتا ہے۔ سب سے پہلے لڈوؤں سے بھری پلیٹ وہ اپنے پڑوسی عمر دین کے گھر بھیجتا ہے۔ جو مقدمہ ہار کے خفیف ہوا مسلمانوں کے ساتھ آ کر سجی ہوئی مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ کے خاموشی سے تسبیح ہلانے لگتا ہے۔ جب رانجھا مسجد میں آتا ہے تو سب سے پہلے عمر دین اٹھ کے اسے گلے لگاتا ہے۔ مبارکباد دیتا ہے۔ اور پوچھتا ہے بیٹی کا نام کیا رکھا۔

رانجھا کہتا ہے۔ یہ بخت آور بیٹی ہے۔ اس کی ولادت سے پھر اس محلے میں مسلمانوں کا سر اونچا ہو گیا۔ میں نے اس کا نام شریفاں سوچا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

اب تمہیں بتاؤں،

تو مولود بچی کون تھی؟

وہ میری ماں تھی۔

اپنی ماں کی طرح خوش وضع، خوش اطوار، خوش زبان اور خوش نواز۔
بڑے لاڈ پیار اور کھرے پن میں ان کی تربیت ہوتی ہے۔
بچپن میں جس سکول وہ پڑھنے جاتی ہیں وہ ہندوؤں اور سکھوں کا ہوتا ہے۔
وہاں وہ بھجن گیت کے پیریڈ میں اپنا سینے سے لگا کے لایا ہوا قرآن نکال کے آسودہ مقدس کلام لحن میں پڑھتی رہتی ہیں۔ لیکن سکھوں ہندوؤں کے تہواروں، ہولی، دسہرہ کے دنوں میں انہی کی طرح خوش رنگ کپڑے بھی زیب تن کرتی ہیں۔ بچپن کی ان کی ساری سہلیاں سکھوں اور ہندوؤں کی بچیاں تھیں۔ تندو، پریم، رجنی، نرمل، رادھا اور سروجنا۔ کچھ سکول کی سہلیاں تھیں کچھ محلے کی۔ سہلیوں کی منڈلی میں شریفاں ایسے تھی جیسے پیالیوں کے جھرمٹ میں اکیلی چائے دانی۔ پھل فروش کی بیٹی تھی۔ سکول جاتی تو بستے میں کتابیں کم اور پھل زیادہ ہوتے۔ گھر میں پھلوں کے کریٹ پڑے ابلتے رہتے۔ سارا محلہ اس نے پھلوں کے باغ کی طرح مہکا دیا۔
پھلوں کو پالنے والا کچھ لوگوں کے نصیب بھی پھل دار پودوں کی طرح پالتا ہے۔
شریفاں کی عمر چودہ پندرہ سال ہوئی تو ایک دن سائیں بگو شاہ کے ڈیرے پہ رانجھے خان پہلوان نے اپنے شہر کا سب سے اونچا گھبرو پولیس سارجنٹ دیکھ لیا۔
سائیں سے پوچھا یہ ہیرا کون ہے؟
سائیں بولا میرا بھتیجا ہے۔
رانجھے خان کا ماؤ میووال میں سائیں بگو شاہ سے ملنا ملانا رہتا تھا۔ اسی گاؤں کے پاس کئی بار رانجھے خان نے اپنے کاروبار کے سلسلے میں آلوؤں اور پیاز کے کھیت بھی خریدے تھے۔ وہیں جا کے اس پہ یہ راز کھلا کے لدھیانہ شہر میں جس گھبرو قد آور اور تیکھے ٹریفک سارجنٹ کو چوک میں اشارہ دیتے ہوئے دیکھ کے سیشن جج کی میم صاب موٹر کی بریک پہ پاؤں رکھے، ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی ہے۔ وہ سائیں بگو شاہ کے منہ بولے بھائی ابوالفضل کا یہی بیٹا فضل دین ہے۔

فضل دین میرے ابا تھے۔

یہ چودہ ستمبر سن انیس سو چوالیس کی بات ہے جب فضل دین اور شریفاں بی بی کی شادی ہوئی۔ رانجھے خان کو اپنے بڑے بھائی، چوہدری غلام محمد کا طعنہ بھولا نہیں تھا۔ اس نے اپنے داماد سے صرف ایک ہی فرمائش کی تھی، کہ بیٹا برات میں شہر کی سب موٹریں لے کے آنا۔ اور ان کے گزرنے کا راستہ یہ ہو کہ ہر گاڑی چوہدری غلام محمد کی گلی سے ہو کے آئے۔

اس زمانے میں لدھیانہ شہر میں کل اٹھارہ موٹر کاریں تھیں۔

فضل دین ٹریفک سارجنٹ تھا۔ اس کے دو چھوٹے بھائی بھی اسی ضلعے کی پولیس میں تھے۔ اٹھارہ کی اٹھارہ موٹریں برات میں شامل تھیں۔ سیشن ہاؤس کی موٹر سمیت۔ موٹروں کے پیچھے سولہ بگھیاں ان کے پیچھے گیارہ تانگے تھے۔ سب دلہنوں کی طرح سجے ہوئے۔ پورے ضلعے کی پولیس مونچھوں کو تاؤ دیے، اونچے شملے کی پگڑیاں باندھے، براتی بنی ہوئی تھی۔

سرکاری بینڈ نے شہر میں ادھم مچایا ہوا تھا۔

پورا شہر اس دن پولیس راہگیروں کو راہ دے رہا تھا۔

چوہدری غلام محمد اور اس کا کنبہ اپنی چوڑی گلی بیچ، اونچی حویلی میں پولیس برات کے ہاتھوں یوں زچ ہوئے بیٹھا تھا جیسے پولیس نے ان کے گھر کا گھیراؤ کر لیا ہو۔ آتش بازی اور بینڈ باجے کا سب سے بڑا مظاہرہ رانجھے خان کے کہنے پہ پولیس والوں نے عین چوہدری غلام محمد کی حویلی کے سامنے کیا تھا۔

جس کھلے احاطے کو رانجھے خان نے عمر دین سے مقدمے میں، مسلمانوں کی اجتماعی فلاح کے لئے جیتا تھا۔ اسی احاطے میں تمبو قناطیں لگا کے برات کا استقبال کیا گیا۔ عمر دین چوک کا نام پھر سے بتی والا چوک تھا اور عین چوک کے درمیان میں بتی والے کھمبے کے ساتھ کیلے کے چھلکوں، رنگ برنگی بتیوں اور شوخ رنگ پھولوں سے

سجے ہوئے آرائشی دروازے کے آگے کھڑے عمر دین نے ادب اور پیار سے پوری برات کا استقبال کیا تھا۔

اس دن رانجھے خان نے اپنے داماد فضل دین کو گلے لگاتے ہوئے، آنکھوں میں خوشی کے آنسو لا کے کہا تھا۔ بیٹا، آج تم نے میرے اور اپنی ساس کے اگلے پچھلے سارے ادھار چکوا دیے۔ سارے مقدمے جتوا دیے۔

برات میں آئے بوڑھے سائیں بگو شاہ نے رانجھے خان کی بات سن لی۔ نکاح پڑھا کے جب وہ فارغ ہوا تو رانجھے خان کو پاس بٹھا کے بولا۔

پہلوان جی، بتی والے اس چوک کو جیتے تو تمہیں بہت برس ہو گئے، مگر چانن دینے والی بتی آج تم نے جیتی ہے۔ آؤ بیٹھ کے میرے ساتھ دعا کرو۔ خدا اس بیاہتا جوڑے کے نصیب میں بتیاں ٹانک دے۔

آمین، رانجھے خان نے دونوں ہاتھ اٹھا کے کہا اور ان ہاتھوں کو منہ پہ ملنے سے پہلے، ایک انگلی اٹھا کے سائیں بگو شاہ کی طرف ملتجیانہ نظر سے دیکھتے ہوئے بولا، ان بتیوں بیچ کم سے کم ایک بتی والا کھمبا بھی۔

سائیں بگو شاہ نے رانجھے خان کی عجیب آرزو سن کے سر وجد سے ہلایا اور بڑے یقین سے آسمان کو تک کے بولا۔

انشاءاللہ۔

بتی والا کھمبا ہی ایسا جس نے روشنی کا میلا لگا دینا ہے۔

□
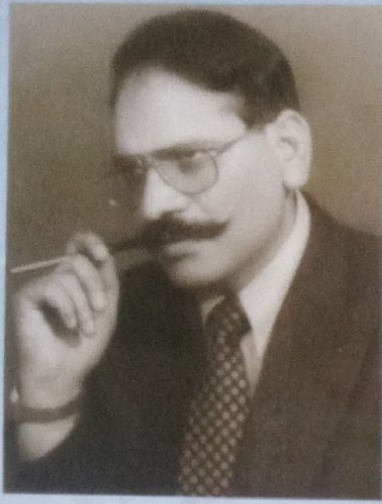
DEHLI KI ARJMAND BANO

by

Abdaal Bela

یہ ''لال خان'' کی اس بیٹی ''ارجمند بانو'' کی کہانی ہے جو کہا کرتا تھا، بیٹی، میں پچھلے جنم میں دہلی کا لال قلعہ تھا۔ وہ جمنا پار چاروں طرف ادب سے سر جھکائے کھڑی رعایا کے بیچ کسی شہنشاہ کی طرح سر اُٹھائے استیادہ لال قلعے کی طرف اشارہ کرتا اور کہتا، میں اواگون نظریے پہ یقین تو نہیں رکھتا، مگر مجھے لگتا ہے پہلے اگر میں کبھی کچھ تھا۔ تو یہی تھا۔

لال قلعہ جو برصغیر کا دل ہے۔ برصغیر کو اگر دنیائے عالم کے ہاتھ کی انگوٹھی مان لیا جائے تو ''دہلی'' اس انگوٹھی کا نگینہ ہے۔ اس نگینے کو نین، مُکھ اور نصیب دیا جائے تو ارجمند بانو کا سراپا اُبھرتا ہے۔ تمہیں ساری بات، پوری کہانی پڑھے بغیر سمجھ نہیں آنی۔ فکر نہ کرو، میں نے تمہاری انگلی پکڑی ہوئی ہے۔ ارجمند بانو اپنے نصیب سے باتیں کرے گی اور میں تم سے۔

Rs. 400.00

www.sangemeel.com

ISBN-10: 969-35-2435-7
ISBN-13: 978-969-35-2435-2
9 789693 524352